قرآن کے تحفظ پر ایک تاریخی نظر

تدوینِ قرآن

افادات:

مولانا سید مناظر احسن گیلانی

مقدمہ: شیخ الحدیث ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی

قرآن کے تحفظ پر ایک تاریخی نظر

افادات:
مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

مولانا کے علم و فضل کے زمانہ شباب میں حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، امام غزالی، امام رازی و شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ کی وسعت معلومات اور تبحر علمی کی یاد تازہ کر دی ہے۔ اس میں مولانا کے بہت سے مضامین و مقالات کے علاوہ سب سے پہلی کتاب "ابوذر غفاری" ہے جو کہ دیوبند سے شائع ہو کر مقبول عوام و خواص بنی، مولانا کی اس پہلی کتاب کو دیکھ کر جو طالب علمانہ دور کی یادگار ہے، مولانا اشرف علی تھانوی نے پیشن گوئی فرمائی تھی کہ اس کتاب کا مؤلف آئندہ چل کر محقق ہوگا، چنانچہ ایسا ہی ہوا قرآنی، حدیثی، فقہی، سیاسی، معاشی علوم میں مولانا نے تحقیق کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ خود آپ کے استاذ عالی مقام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ بھی ان کے کمال کے معترف تھے، اس کے علاوہ آپ کی مشہور و مقبول ترین تصنیفات: "نظام تعلیم و تربیت"، "الدین القیم"، "النبی الخاتم"، "تدوین حدیث" اور "تدوین قرآن"، "تدوین فقہ" کے علاوہ بہت سے مسودات اب بھی مولانا کے خاندان میں محفوظ ہیں، جن کی طباعت و اشاعت امت کی موجودہ دور کے اہل علم سے بطور خاص مطالبہ کرتی ہے۔

مولانا کا جو سرمایہ علم و فضل کتابوں اور رسالوں میں چھپ کر باہر آ چکا ہے لیکن جتنے مقدار میں اس سے بہت زیادہ اور معیار میں اس سے بلند تر ذخیرہ ابھی مسودات ہی کی شکل میں محفوظ ہے۔

جیسا کہ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ مولانا کی کوئی کتاب بھی باضابطہ تحقیق کی پروگرام کے تحت انجام نہیں پائی ہی ہوتا یہ کہ کسی نے کسی مصلحت کی فرمائش کی، مولانا لکھنے بیٹھ گئے جب لکھ چکے تو وہ مضمون، مضمون نہ رہا بلکہ کتاب بن گئی، چنانچہ کئی کتابیں مولانا کی اسی قبیل کی تصنیفات ہیں اس ضمن میں آپ کے شاگرد خاص "مولانا غلام محمد صاحب

(ایم۔اے۔ عثمانیہ) مقالات احسانی کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں: "مولانا کی اپنی تحریر
کا اس طور پر مرتب و مربوط نہیں ملتی جس کا دوران قدر زیادہ ہوتا تھا کہ متعلق اور غیر متعلق کا
انتخاب ان کے لئے محال ہو جاتا تھا وہ تیزی سے قلم بند فرماتے تھے اور قلم روکنے سے پہلے
ان کو خود بھی اندازہ نہ ہوتا تھا کہ جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ مضمون ہو جائے گا یا کتاب بن جائے
گی دوران کے مسودوں کی ترتیب و تدوین ان کے معتقد علیہ شاگردوں اور عقیدت مندوں کے
سپرد ہوتی تھی۔"

اب زیر نظر کتاب کی طرف آئیے! تدوین قرآن جو کہ مولانا کی یادگار تصنیف
ہے جس میں آپ نے جامع القرآن کے متعلق عوام الناس کے یہاں جو غلط فہمی پھیلی ہوئی
ہے اس غلط فہمی کا ازالہ کے لئے آپ نے نہایت خوش اسلوبی انداز سے اس کی حقیقت بتائی اور
اس کا سد باب پیش کیا۔

اس کے علاوہ قرآن کی کتابت کس طرح ہوئی اور اس کی ابتدائی حالت کیا تھی؟
اور قرآن کریم ابتداء میں کس چیز پر لکھا گیا اور لکھنے والے کون تھے؟ چونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ
وسلم خود امی تھے۔ ان جیسے دیگر مضامین پر مولانا موصوف رحمہ اللہ نے ایک نہایت ہی
آسان انداز میں یہ کتاب "تدوین قرآن" تحریر فرمائی۔ اور اسی کتاب کا جوہری خلاصہ
آپ کے شاگرد رشید مولانا غلام محمد ربانی صاحبؒ نے نکال کر ہمارے سامنے رکھا تا کہ ہم اس کو
پڑھ کر آئندہ آنے والے فتنوں کا سد باب کر سکیں

"تدوین قرآن" پہلی مرتبہ ندوۃ المصنفین دہلی سے چھپی تھی، دوسری بار مکتبہ
اسحاقیہ جونا مارکیٹ کراچی سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ ہمارے پیش نظر بھی آخری طبع
ہے طبع مذکور (۱۰۴) صفحات پر کوئی تصحیح کے ساتھ شائع کی گئی تھی۔

عرصہ دراز سے یہ کتاب مارکیٹ میں دستیاب نہ تھی، ضرورت تھی کہ اسے دوبارہ شائع کیا جائے۔ طبع دوم میں بہت اغلاط تھیں بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ طبع اول میں کچھ اغلاط رہ گئی تھیں۔ عبارتوں میں قطع و برید، مراجع کے جلد نمبر، اور صفحہ نمبر غلط، آیتوں کے حوالے میں بھی غلطیاں ہوئی تھیں، کہیں کتاب کا حوالہ رہ گیا ہے، اس طبع میں مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھا گیا ہے۔

(۱) تمام آیات کے ساتھ سورت کا نام اور آیت نمبر درج کیا گیا ہے۔

(۲) تمام احادیث کو اصل مرجع و ماخذ میں تلاش کیا گیا اور ان کی تصحیح کی گئی اور کتابوں کا حوالہ بھی درست کیا گیا ہے اور جہاں تخریج کی ضرورت پیش آئی تو حاشیہ میں اسکی تخریج بھی کی گئی ہے۔

(۳) اس کے علاوہ جن کتابوں سے حضرت مصنفؒ نے عبارتیں پیش کی ہیں ان کو اصل مرجع میں تلاش کیا گیا اور ان کی تصحیح کی گئی۔

(۴) کتابوں کی طبعات مختلف ہوتی ہیں ایک ہی طبع کے مطابق جلد نمبر اور صفحہ نمبر لگائے گئے ہیں۔

(۵) اور صحیح کی تعیین کے لئے کتاب کے آخر میں مراجع و مصادر کی فہرست پیش کی گئی ہے، جس میں کتاب کا نام، مصنف کا نام، سن وفات، طبع اور سن طباعت کا اہتمام کیا گیا ہے۔

"تدوین قرآن" کے مقدمے کے لئے حضرت استاذ محترم مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی صاحب مدظلہ کی خدمت میں پیش کی گئی تھی استاذ محترم نے اپنے قیمتی اوقات میں سے وقت نکال کر مقدمہ لکھا اور اغلاط کی نشاندہی فرمائی لیکن استاذ محترم نے "مکانة

"الامام محمد بن الحسن الشیبانی فی الحدیث" اور "تاریخ التفقیہ والفقہ فی الاسلام" کی تکمیل میں مصروفیت کی بنا پر تصحیح سے معذرت فرمائی اور یہ کام مولوی محمد اسداللہ تخصص فی الحدیث جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے سپرد فرمایا اور انہوں نے حسب ارشاد تصحیح وتخریج فرمائی۔

آخر میں اپنے اساتذہ کرام "مولانا محمد انور بدخشانی صاحب دامت برکاتہم" اور "مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی صاحب" جنہوں نے اپنی مصروفیات اور مشاغل کے باوجود تقریظ اور تفصیلی مقدمہ تحریر فرمایا (یہ ان کی محبت ہے) میں ان کا شکر گذار ہوں، اور مولوی اسداللہ صاحب کا بھی شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اپنے قیمتی وقت کو اس کام کے سپرد کیا اور علمی جواہر کا انتخاب کیا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور ان اساتذہ کا سایہ ہمارے سروں پر تادیر سلامت رکھے۔ (آمین)

محمد یمین

عرضِ ناشر

ایک مسلمان کیلئے اہم ترین ہستی کون ہے؟ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب ایک ہی ہوسکتا ہے۔ یعنی اس سلسلے میں دو رائے کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ یہ بات طے ہے کہ ایک مسلمان کیلئے اہم ترین ہستی اللہ تعالیٰ کی ہے جو خالق ہے، مالک ہے، پالنہار ہے، اور اسکے عارفین کہہ گئے: "لا مطلوب الا اللہ، لا مقصود الا اللہ" یعنی اللہ کے علاوہ ہمارا کوئی مطلوب ہے نہ مقصود ہے۔ تو چونکہ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے اہم ترین ہستی ہے اس لئے اس کا پیغام اور اس پیغام کو لانے والے پیغمبر بھی ہمارے لئے ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام "قرآن" کے روپ میں ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ جو دنیا و آخرت میں ہماری کامیابی، کامرانی اور سرفرازی کا ذریعہ ہے بشرطیکہ ہم اسکے حقوق ادا کریں۔

زیرِ نظر کتاب "تدوینِ قرآن" پڑھنے سے پہلے تو میں یہی سمجھتا تھا کہ قرآن کے ہم پر پانچ (۵) یا زیادہ سے زیادہ چھ (۶) حق ہیں مگر یہ کتاب دیکھنے کے بعد میں یہ سمجھتا ہوں کہ بات اس سے ذرا آگے ہے۔ لیکن اگلی بات کرنے سے پہلے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ پہلی بات یعنی قرآن کے بنیادی پانچ، چھ حقوق بیان کر دیئے جائیں اور وہ مشہور و معروف

حقوق یہ ہیں کہ:

۱۔ قرآن پر ایمان لانا، اس کی بات پر صدق دل سے یقین کرنا۔

۲۔ قرآن کی تلاوت کرنا، مطالعہ کرنا۔

۳۔ قرآن کو سمجھنا، اس کا فہم حاصل کرنا۔

۴۔ قرآن پر عمل کرنا، اپنی زندگیاں اس کے مطابق ڈھالنا۔

۵۔ اسکی تعلیمات دوسروں تک پہنچانا۔

۶۔ اجتماعی طور پر اسکا عملی نفاذ کرنا۔

یہ تھے قرآن کے وہ عمومی حقوق جو پہلے سے سنتے چلے آرہے تھے۔ اللہ تعالی ہمیں ان کی ادائیگی کی توفیق دے تاکہ ہم اچھی زندگی گذاریں اور مبارک موت پائیں اور مرنے کے بعد بھی خوشگوار زندگی ہماری منتظر ہو۔ (آمین)

اب آیئے اگلی بات کی طرف کہ یہ کتاب "تدوین قرآن" دیکھنے کے بعد یہ بات کھلی کہ قرآن کا دفاع اور قرآن کی حفاظت بھی ہمارا فرض ہے اور قرآن کا حق ہے۔ اگرچہ قرآن کی حفاظت اللہ تعالی نے اپنے ذمے لے رکھی ہے، لیکن اسی قرآن میں اللہ نے ہمیں یہ فرمایا ہے کہ "ان تنصروا اللہ ینصرکم" یعنی اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے بارہویں پارے کے شروع میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ "وما من دآبۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا" یعنی زمین پر چلنے والا ایک بھی سر (یعنی ذی نفس) نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ ہر ایک کے رزق کا ذمہ دار ہے مگر دیکھئے خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کی جانب جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ دریائے نیل کے کنارے اگر ایک کتا بھی بھوک کی وجہ

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر

تقریظ

از استاذِ حدیث مولانا محمد انور بدخشانی مدظلہ العالی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن کریم جہاں ہماری دینی، ایمانی، مذہبی، علمی، دنیوی اور اخروی کتاب ہے، وہاں یہ پچھلی تمام آسمانی کتابوں کی مصدق، مؤید اور مہیمن بھی ہے۔ اس عظیم کتاب کی تدوین کا انتظام ابتدائے نزول ہی میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ کے ذریعے کیا، چونکہ یہ آخری اور ابدی کتاب تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود اعلان فرمایا

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (سورۃ الحجر، آیت ۹)

پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کے لیے مختلف طریقے بروئے کار لائے۔ ایک طرف صحابہ و امت کے دل و دماغ قرآنی قانون ہدایت و اصول نجات بشری کو اپنے سینوں میں محفوظ کرنے لگے تو دوسری طرف پیغمبر ﷺ کو حکم دیا کہ سورتوں اور آیتوں کو جمع کرکے کتابی و تحریری شکل میں ترتیب دیں۔ تدوین قرآن کی اسی اہمیت کے پیش نظر سب سے پہلی وحی (سورۃ اقرأ) میں قراءت اور قلم کا تذکرہ کرکے اسی طرف اشارہ دیا کہ اس وحی (قرآن کریم) کی حفاظت کے لیے قراءت (پڑھنے) اور قلم (لکھنے) دونوں کی یکساں ضرورت ہے۔

پھر اس آیت پر ذرا غور فرمائیے:

۱۔ ﴿تنزیل الکتاب من اللہ العزیز الحکیم﴾ (سورۃ احقاف، آیت ۲)

۲۔ ﴿وھذا کتاب انزلناہ مبارک﴾ (سورۃ انعام، آیت ۵۵)

۳۔ ﴿ذلک الکتاب لاریب فیہ﴾ (سورۃ بقرہ، آیت ۲)

۴۔ ﴿الحمد للہ الذی انزل علی عبدہ﴾ (سورۃ کہف، آیت ۱)

یہ تمام آیات اس وقت نازل ہوئیں جبکہ قرآن کتابی شکل میں یکجا مرتب موجود نہ تھا، اس کا مطلب یہی تھا کہ اس کتاب آسمانی کی بقا کے لیے کتابت اور تدوین لازمی ضروری ہے۔

اور اب ان آیات کو دیکھئے

۱۔ ﴿والطور و کتاب مسطور﴾ (سورۃ طور، آیت ۱،۲)

۲۔ ﴿ن والقلم وما یسطرون﴾ (سورۃ قلم، آیت ۱)

۳۔ ﴿ان علینا جمعہ وقرآنہ﴾ (سورۃ قیامۃ، آیت ۱۷)

یہ تمام آیات اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ یہ آسمانی وحی جلد سے جلد جمع، تدوین، ترتیب اور کتابت کا جامہ زیب تن کرنے والی ہے، جیسا کہ ایک کتاب کے لیے لازم ہے، اور اس کی حفاظت اور بقا کی ضامن بھی یہی چیزیں ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم کی تدوین و ترتیب و کتابت تین مراحل میں پایہ تکمیل تک پہنچی، عہد نبوی، عہد صدیقی اور عہد عثمانی میں۔

بے شک بہت سارے مستشرقین اور مورخین نے اس اہم موضوع کو مبہم، غیر واضح اور پیچیدہ بنا کر پیش کیا ہے۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ نے تدوین

قرآن کے متعلق اس رسالے میں نہایت عمدہ، مدلل اور موجز باتیں سپرد قلم کی ہیں، مولانا مرحوم کی کوئی مستقل کتاب نہیں ہے بلکہ تدوین قرآن سے متعلق آپ کے مختلف مضامین ہیں جنہیں آپ کے شاگرد رشید نے یکجا کر دیا تھا۔ اس موضوع پر "تدوین حدیث" کی طرح آپ نے مستقل کتاب بھی تحریر فرمائی تھی لیکن افسوس کہ وہ شائع نہ ہو سکی، اور اس رسالے کو اس مستقل کتاب کا "جوہری خلاصہ" کہہ کر شائع کروا دیا گیا۔ یہ رسالہ صاحب رسالہ کی نظر میں گیا ہے۔"

"انشاء اللہ اس وقت آپ کو ان چند اوراق میں وہ سب کچھ مل جائے گا جو شاید بڑے سے بڑے کتب خانوں کے کتابی ذخیروں میں بھی نہیں مل سکتا، اسی وقت اس چھوٹی سی مختصر کتاب کی وقعت و قیمت کے متعلق اندازہ ہو سکتا ہے کہ لوگوں کو جو آج ملے گا اور مفت وقت پر وہ تحریری انہیں اوراق سے میسر آ سکے گا جو شاید اس کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا۔ تقریباً تیس چالیس سال کے مسلسل فکر و نظر، تلاش و جستجو کے آخری تحقیقی نتائج اس کتاب میں درج ہیں۔"

درج بالا کلام مبالغہ نہیں حقیقت ہے، زیر نظر رسالہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کا واقعی مصداق ہے، اس رسالے کی اشاعت نہ صرف یہ کہ ایک علمی ضرورت ہے بلکہ ایک اہم دینی فریضہ بھی ہے۔

محمد انور بدخشانی

جامعہ علوم اسلامیہ

علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی

۲۱-۳/۷۳۲ھ

مقدمہ

از مولانا ڈاکٹر محمد عبد الحلیم چشتی صاحب دامت برکاتہم *

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا سید مناظر احسن گیلانی (۱) (۱۸۹۲ء=۱۹۵۶ء) نے "تدوین قرآن" کے موضوع کے روایتی ذخیرے پر جو شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں ان کو دور کرنے کے لئے اردو زبان میں ایک مبسوط و ضخیم کتاب لکھی تھی جو ان کے کم و بیش تیس چالیس برس کے مطالعہ و غور و فکر کا حاصل تھا، چنانچہ موصوف کا بیان ہے:

"تقریباً تیس چالیس سال کے مسلسل غور و تامل، تلاش و تجسس کے آخری تحقیقی نتائج اس کتاب میں درج ہیں۔ جن لوگوں نے قرآن کے جمع و ترتیب کی متعلقہ روایتوں کا مطالعہ کیا ہے وہ دیکھ سکتے ہیں کہ کتنے فاحش اغلاط اور پیچ در پیچ ہوائی مغالطوں کے پہاڑوں کو کتنی آسانی کے ساتھ اڑا دیا گیا ہے۔ شکوک و شبہات کے سارے بادل پھاڑ دیئے گئے ہیں اور ناجائز نفع اٹھانے والوں کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی گئی ہے۔" (۲)

---

* استاذ شرف تخصص فی علوم حدیث جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

(۱) مولانا گیلانی کے حالات اور ان کی تالیفات کے متعلق "ہزار سال پہلے" کے مقدمہ میں ہم لکھ چکے ہیں۔

(۲) تدوین قرآن ص ۳۳

کتاب چونکہ مبسوط و ضخیم تھی ان کے شاگرد رشید و رفیق مولوی غلام ربانی (ایم اے عثمانیہ) نے اسے پڑھا اور اس کا خلاصہ تیار کیا مولانا کو دکھایا، انھیں پسند آیا، چنانچہ مولانا گیلانی نے جو اس پر پیش لفظ لکھا ہے اس میں موصوف کی اس کامیاب کوشش کو سراہا ہے، اور ان کے استنباط و نتائج، اسلوب بیان، اور دل نشین تعبیر کی تعریف کی ہے اور اپنی ضخیم تالیف کا اسے "جوہری خلاصہ" قرار دیا اور پھر اپنی اصل تالیف کی اشاعت سے ہاتھ اٹھا لیا، چنانچہ خود فرماتے ہیں:

"حق تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ خاکسار کے رفیق محترم مولوی غلام ربانی ایم اے (عثمانیہ) نے اس فقیر سراپا تقصیر کی تھکا دینے والی اور دماغ سوزیوں کے ان نتائج کو بڑے پاکیزہ اسلوب اور دل نشین تعبیر میں اس کتاب کے اندر جمع کر دیا ہے، اگرچہ فقیر نے خود بھی اس عنوان پر مستقل کتاب لکھی ہے، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے میری کتاب کے اس "جوہری خلاصہ" کے شائع ہو جانے کے بعد اب اصل کتاب کی اشاعت کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی ہے، کیونکہ اس ضخیم و مبسوط کتاب کے اکثر جوہری حقائق و اصولی مشتملات اس مختصر کتاب میں محفوظ ہو گئے ہیں، حق تعالیٰ مولوی غلام ربانی کی اس محنت کا صلہ دین اور دنیا میں عطا کرے۔" (۱)

موصوف کے مذکورہ بیان سے ہمارے اس خیال کی مزید تائید ہوتی ہے کہ مولانا مناظر احسن گیلانی اپنی تصنیف میں ابھرتے ابھرتے نکل جاتے ہیں اور عنوان و موضوع کے پابند نہیں رہتے ہیں، ان کے علم کی وسعت و پہنائی اور قلم کی جولانی موضوع و عنوان کی پابندی کو گوارا نہیں کرتی۔

(۱) تدوین قرآن ص: ۳۳

مولانا مناظر احسن گیلانی نے "تدوین قرآن ص ۳۴" پر حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ (المتوفی ۴۳ھ) کے متعلق حاشیہ میں مؤرخ اسلام حافظ شمس الدین بن احمد (المتوفی ۷۴۸ھ) کی کتاب "تذکرۃ الحفاظ" کے حوالہ سے یہ نقل کیا ہے:

"ان سے اتنا تو سمجھئے کہ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ، جو علمائے بنی اسرائیل میں سے تھے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی سعادت ان کو حاصل ہوئی تو انہوں نے عرض کیا کہ "قرآن" کے ساتھ "تورات" کی تلاوت بھی جاری رکھوں! آپ نے فرمایا: "اقرأ هذا ليلة وهذا ليلة" (یعنی ایک رات قرآن پڑھو اور ایک رات تورات) (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۹)

طبقات ابن سعد میں بھی ابوالجلد الجونی کے تذکرے میں لکھا ہے کہ سات دن میں قرآن اور چھ دن میں تورات ختم کرنے کا عام دستور اپنے لئے انہوں نے مقرر کیا تھا اور ختم کے دن لوگوں کو جمع کرتے تھے کہ اس دن رحمت نازل ہوتی ہے۔

(ابن سعد ج ۷/۱ ص ۱۶۱)

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ قرآن کی صحیح رہنمائی میں اس قسم کی کتابوں کے پڑھنے سے جہاں تک میرا ذاتی تجربہ ہے خود قرآن کے سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔(۱)

تدوین حدیث میں بھی مولانا گیلانی نے ان دو واقعات کو نقل کر کے اس خیال کا اظہار فرمایا ہے اور اپنی اس تحقیق پر اصرار فرمایا ہے۔(۲)

اور مولانا مناظر احسن گیلانی کے شاگرد رشید محمد ربانی نے ذیلی سرخی "قرآن مجید آسمانی کتابوں کا آخری پیغام ہے" کے تحت جو عبارت لکھی ہے:

(۱) تدوین قرآن ص ۳۴، ۳۵

(۲) ملاحظہ ہو تدوین حدیث ص ۲۳۸، ۲۳۹، دوسرا ایڈیشن ص ۲۱۱ [illegible]

تھیں منسوخ ہوتی رہیں۔ آنحضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی اور آخری کتاب دے کر بھیجا گیا اور دین و شریعت کی تکمیل کر دی گئی۔ قرآن نے کہا ہے

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا" (۱)

ترجمہ: "(اور) آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا۔" (۲)

لہذا سابقہ شریعتیں اور کتاب سب قابل اعتبار نہیں رہیں اس لئے قرآن کی حفاظت ان اقوام کی ذمہ داری تھی۔ قرآن نے کہا

"اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِیْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ یَحْکُمُ بِهَا النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ کِتٰبِ اللّٰهِ وَکَانُوْا عَلَیْهِ شُهَدَآءَ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ" (۳)

ترجمہ: "بیشک ہم نے تورات نازل فرمائی جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ اسی کے مطابق انبیاء جو (خدا کے) فرمانبردار تھے یہودیوں کو حکم دیتے رہے ہیں اور مشائخ اور علماء بھی کیونکہ وہ کتاب خدا کے نگہبان مقرر کئے گئے تھے اور اس پر گواہ تھے (یعنی حکم الٰہی کا یقین رکھتے تھے) تو تم لوگوں سے مت ڈرنا اور مجھی سے ڈرتے رہنا

---

(۱) سورۃ المائدہ: ۳

(۲) ترجمہ فتح محمد جالندھری

(۳) سورۃ المائدہ: ۴۴

میں نے قرآن اور تورات دونوں پڑھی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک رات قرآن پڑھا کرو اور ایک رات تورات۔

علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ اگر یہ روایت درست ہے تو اس میں تورات کو باری باری پڑھنے اور اس میں غور و فکر کی گنجائش نکل سکتی ہے۔"

نیز علامہ شمس الدین ذہبی "سیر اعلام النبلاء" میں مذکورہ روایت نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"اسناده ضعيف فان صح، ففيه رخصة في النظر في التوراة التي لم تبدل، فأما اليوم فلا رخصة في ذلك لجواز التبديل على جميع نسخ التوراة الموجودة، ونحن نعظم التوراة التي أنزلها الله على موسى عليه السلام، ونؤمن بها، فأما هذه الصحف التي بأيدي هؤلاء الضلال فما ندري ما هي أصلاً، ونقف، فلا نعاملها بتعظيم ولا بإهانة، بل نقول: آمنا بالله وملائكته وكتبه ورسله، ويكفينا في ذلك الإيمان المجمل، ولله الحمد. (۱)

ترجمہ: "اس روایت کی سند ضعیف ہے اگر صحیح بھی مان لی جائے تو اس سے وہ تورات مراد ہوگی جس میں تبدیلی و تحریف نہ ہوئی ہو اور آج کل کی تورات تو اس کی اجازت نہیں ہے کیونکہ موجودہ تورات کے تمام نسخوں میں تحریف کا امکان ہے، ہاں ہم اس تورات کی تعظیم کرتے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اتاری گئی ہے اور اسی پر ایمان لاتے ہیں اور آج کل جو صحیفے ان گمراہ لوگوں کے پاس ہیں ہمیں معلوم نہیں

(۱) سیر اعلام النبلاء، ج: [illegible]، ص: [illegible]، ط: مؤسسۃ الرسالۃ، طبع سوم [illegible]ھ

آسان ہو تو عالم کے لئے اس میں تھوڑی بہت گنجائش ہے ورنہ بہتر یہ ہے کہ صرف نظر کرے۔ اور وہ روایت جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہؓ کو ایک رات قرآن پڑھنے اور ایک رات تورات پڑھنے کی اجازت دی ہے تو وہ موضوع اور جھوٹ ہے۔ اللہ برا کرے جس نے اس کو گھڑا ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد عبداللہ بن سلام ہے اور بعض فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت غور و فکر (تقابلی مطالعہ) کرنے کی ہے نہ کہ تہجد میں اس کی تلاوت کرنے کی۔"

نیز علامہ حافظ نورالدین ہیثمی (المتوفی ۸۰۷ھ) "مجمع الزوائد" میں مذکورہ روایت یوں نقل کرتے ہیں:

"عن عبداللہ بن سلام قال: قلت: یارسول اللہ قد قرأت القرآن والتوراۃ والانجیل. قال. اقرأ بھذا لیلۃ وھذا لیلۃ."

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن سلام فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں نے قرآن اور تورات اور انجیل پڑھی ہیں۔ آپ نے فرمایا: کہ ایک رات قرآن پڑھا کرو اور ایک رات تورات و انجیل۔"

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"رواہ الطبرانی فی الکبیر وفیہ من لم أعرفہ عتاب بن ابراھیم وغیرہ." (۱)

ترجمہ: "اس روایت کو طبرانی نے معجم کبیر میں نقل کیا ہے اور اس میں عتاب بن ابراہیم وغیرہ راوی کو میں نہیں جانتا۔ (یعنی مجہول ہیں)

(۱) مجمع الزوائد ۱/۱۷۰

مذکورہ بالا روایت متصل سند کے ساتھ علامہ حافظ ابونعیم اصفہانیؒ (المتوفی ۴۳۰ھ) نے کتاب "ذکر اخبار اصبہان" (۱) میں اپنی حسب ذیل سند سے نقل کی ہے:

"حدثنا أبي ثنا محمد بن أحمد بن يزيد ثنا أحمد بن محمد بن الحسين، حدثني جدي الحسين بن حفص ثنا ابراهيم بن محمد بن أبي يحيى المدني ثنا معاذ بن عبدالرحمن عن يوسف بن عبدالله بن سلام عن أبيه أنه جاء الى النبي صلى الله عليه وسلم فقال: اني قرأت القرآن والتورة فقال: اقرأ بهذه ليلة وبهذا ليلة."

ترجمہ: "ابونعیم کا بیان ہے کہ ہم سے میرے والد عبداللہ بن احمد نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمد بن احمد بن یزید نے بیان کیا ان سے احمد بن محمد بن الحسین نے، وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے میرے دادا حسین بن حفص نے بیان کیا، ان سے معاذ بن عبدالرحمٰن نے، انہوں نے یوسف بن عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہما سے، انہوں نے اپنے والد عبداللہ بن سلام سے... الخ

علامہ ابن عساکرؒ نے بھی اس واقعہ کو "تاریخ دمشق" میں ابونعیم کی سند سے ذکر کیا ہے۔ (۲)

(۱) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حافظ ذہبیؒ کو اس روایت کی صحت میں ہی شک ہے۔

---

(۱) ج ۱، ص ۸۳، مطبوعہ بریل لیڈن ۱۹۳۱ء

(۲) ملاحظہ ہو تہذیب تاریخ دمشق الکبیر، ج ۶، ص ۲۵۰، طبع دار احیاء التراث العربی طبع سوم [illegible]

۲) پھر اس کا راوی "ابراہیم بن ابی یحییٰ" معتبر اور ثقہ نہیں، جھوٹا اور کذاب ہے۔(۱)

۳) نیز یہ اس صحیح حدیث کے خلاف ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تورات دیکھ کر ناراضگی کا اظہار فرمایا تھا۔ وہ روایت یہ ہے:

"وعن جابر أن عمر بن الخطاب رضي الله عنهما أتى رسول الله صلى الله عليه وسلم بنسخة من التوراة فقال: يا رسول الله! هذه نسخة من التوراة، فسكت فجعل يقرأ ووجه رسول الله صلى الله عليه وسلم يتغير فقال أبو بكر: ثكلتك الثواكل! ما ترى ما بوجه رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ فنظر عمر إلى وجه رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: أعوذ بالله من غضب الله وغضب رسوله رضينا بالله ربا وبالإسلام دينا وبمحمد نبيا. فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: والذي نفس محمد بيده لو بدا لكم موسى فاتبعتموه وتركتموني لضللتم عن سواء السبيل، ولو كان حيا وأدرك نبوتي لاتبعني." (۲)

---

(۱) مزید ملاحظہ فرمائیں: تقریب التہذیب، ج ۱، ص ۵۵، مع تعلیق تحقیق خلیل مامون شیحا طبع دار المعرفہ بیروت لبنان طبع ۱۴۲۲ھ

(۲) رواہ الدارمی، مشکوٰۃ بشرح المرقاۃ لملا علی القاری، ج: ۱، ص: ۳۳۹، طبع حقانیہ ملتان، وفتح المنان شرح کتاب الدارمی، ج: ۳، ص: ۱۹۱، طبع دار البشائر بیروت طبع اول ۱۴۱۹ھ

ترجمہ: "حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تورات
کا ایک نسخہ لیکر آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ تورات کا
نسخہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو
پڑھنا شروع کیا اور (غصہ کی وجہ سے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہو رہا
تھا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے عمر تمہاری ماں تم پر روئے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کے چہرہ پر غصہ کے آثار تمہیں دکھائی نہیں دے رہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی
اللہ علیہ وسلم کے چہرہ کی طرف دیکھا اور کہا: میں اللہ اور اس کے رسول کے غصہ سے اللہ
کی پناہ چاہتا ہوں۔ ہم اللہ کو رب ماننے پر اور اسلام کو دین تسلیم کرنے پر اور محمد صلی
اللہ علیہ وسلم کو نبی ماننے پر راضی وخوش ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس
ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف
لائے اور تم ان کی اتباع کرو اور مجھے چھوڑ دو تو تم سیدھی راہ سے بھٹک جاؤ گے، اور
اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے اور میری نبوت کا زمانہ پاتے تو میری اتباع
کرتے۔"

مذکورہ بالا حدیث سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ (تقابلی مطالعہ کے علاوہ)
ان کتابوں کا پڑھنا درست ہی نہیں اسلئے کہ یہ سب اب منسوخ ہیں، اسلئے کہ ناسخ کی
موجودگی میں منسوخ کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہتی۔

مناظر احسن گیلانی حضرت عمرؓ کے مذکورہ قصہ کے بارے میں تدوین حدیث
میں فرماتے ہیں:

"باقی طبرانی وغیرہ کے حوالے سے حضرت عمرؓ کے متعلق جو یہ روایت منسوب کی گئی

ہے کہ وہ تورات کا ایک مجموعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لائے اور عرض کرنے لگے کہ بنی زریق میں مجھے اپنے ایک بھائی سے یہ مجموعہ ملا ہے، کہتے ہیں کہ اس حال کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ غضبناک ہو گیا، حضرت عمرؓ کو جب اس کا احساس ہوا تو معافی مانگنے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کہ اس وقت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ رہتے تو بجز میری پیروی کے ان کے لئے بھی کوئی گنجائش نہ ہوتی۔"

مجمع الزوائد میں اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ اس کی سند میں "ابو عامر قاسم بن محمد الاسدی" ایک شخص ہے درحقیقت یہ مجہول راوی ہے اس لئے روایت خود بھی مشتبہ ہے تاہم یہ ممکن ہے کہ اس یہودی کو بھائی قرار دینے پر عتاب کیا گیا ہو۔ نیز اور بھی اسباب اس کے ہو سکتے ہیں۔ بہرحال یہ جانتے ہوئے کہ تورات کا نسخہ بہت کچھ محرف ہو چکا ہے بجز قرآن پڑھنے والے کو اسی محرف تورات کی تلاوت کی جو اجازت دی گئی تو اس کی وجہ ظاہر ہے کہ محرف تورات کا صحیح تو ان کے پاس موجود تھا یعنی قرآن اور قرآن کو صحیح بنا کر جو بھی تورات پڑھنے کا کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ گمراہی میں مبتلا ہو بلکہ تھوڑا بہت فائدہ ہی حاصل کرے گا۔"

(تدوین حدیث ص ۳۲۹، اردو ایڈیشن، مکتبہ اسحاقیہ کراچی)

تو مولانا گیلانی کا یہ کہنا کہ "اس کی سند میں" ابو عامر قاسم بن محمد الاسدی" ایک شخص ہے درحقیقت یہ مجہول راوی ہے اس لئے روایت خود بھی مشتبہ ہے" یہ حقیقت پر مبنی ہے لیکن مولانا نے اس پہلو پر غور نہیں فرمایا کہ حدیث کے اور بھی طرق ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ طبرانی کی سند میں مجہول راوی ہے لیکن دارمی کی روایت جو ہم نے نقل کی ہے اس میں کوئی راوی مجہول نہیں۔ دارمی کی سند ملاحظہ ہو:

"أخبرنا محمد بن العلاء ثنا ابن نمير عن مجالد، عن

عامر، عن جابر أن عمر بن الخطاب ... الخ"

فتح الستان شرح دارمی میں اس سند کے بارے میں لکھتے ہیں:

"واسناد الاثر علی شرط الصحیح غیر مجالد وقد اخرج له مسلم فی المتابعات والشواهد فالحدیث صحیح لغیره، ومما یدل علی قوة اسناده صنیع الامام البخاری رحمه الله، حیث بوب له فی الاعتصام من الصحیح. فقال: باب قول النبی صلی الله علیه وسلم: لاتسالوا أهل الکتاب عن شیء."

قال الحافظ: هذه الترجمة لفظ حدیث أخرجه أحمد والبزار من حدیث جابر ... وذکره ثم قال: ورجاله موثقون الا أن مجالد ضعیفا، واستعمله فی الترجمة لورود مایشهد بصحته من الحدیث الصحیح.

ترجمہ: ”اس حدیث کی سند صحیح کے درجے کی ہے مجالد کے علاوہ (جس کے تمام راوی صحیحین کے ہیں) امام مسلمؒ نے مجالد کی حدیث متابعات اور شواہد میں ذکر کی ہے اس بناء پر یہ حدیث صحیح لغیرہ ہے، امام بخاری نے صحیح بخاری میں کتاب الاعتصام میں جو باب باندھا ہے "باب قول النبی صلی الله علیه وسلم لاتسالوا أهل الکتاب عن شیء" امام بخاری کے اس طرز بیان سے بھی اس حدیث کی سند کو تقویت ملتی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ اس باب کے تحت شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "یہ اس حدیث کا ٹکڑا ہے جس کو بزار اور امام احمد نے روایت کیا ہے" اور حضرت جابرؓ کی پوری حدیث ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں" کہ اس سند کے

دمِ ایجعت: ڈاکٹر بشار عواد معروف۔

"تدوینِ قرآن" کا یہ "جوہری خلاصہ" جو پاکستان کراچی میں آج سے ۱۹ سال قبل شائع ہوا تھا مولوی محمد امین بن صابر حسین (اللہ انھیں خوش رکھے) اسے از سرِ نو شائع کر رہے ہیں۔ ان کی یہ سعی لائق تحسین اور قابل مبارک باد ہے۔ اُمید ہے کہ طلبہ اور اہلِ ذوق اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

محمد عبد الحلیم چشتی

۲۰/۵/۱۴۲۶ھ

=۲۸/۶/۲۰۰۵ء

تمہید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفی والصلوٰۃ والسلام علی عبادہ

الذین اصطفیٰ

امابعد وقت پڑنے سے پہلے بعض کتابوں کی صحیح قدر و قیمت کا لوگوں کو اندازہ نہیں ہوتا، لیکن ضرورت جب پیش آ جاتی ہے تو دنیا بڑی بے کسی کے ساتھ اس وقت اُن کتابوں کو ڈھونڈتی ہے۔

تقریباً کچھ یہی حال اس "کتابچہ" یا "مقالہ" کا بھی ہے، پیغمبروں کے خاتم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس حال میں بنی نوع انسان کے آسمانی دستور اور الٰہی قانون کی آخری شکل یعنی قرآن مجید کو دنیا میں چھوڑ کر تشریف لے گئے، ٹھیک اسی طرح بے سر مو تفاوت کے بغیر یہ "خدائی صحیفہ" آج بھی دنیا میں موجود ہے خدا کا شکر ہے کہ مسلمانوں ہی کا یہ مسلمہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ غیر اسلامی دائروں کی بھی یہ ایک جانی پہچانی مانی ہوئی بات ہے اسی لیے قرآنی آیات وسور کے جمع و ترتیب کی سرگزشت کی تلاش کی عام طور پر ضرورت سمجھی نہیں جاتی مگر خدانخواستہ بد اندیشی سے کام لینے کی بدبختانہ جرأت اگر کبھی کی گئی تو مسلمانوں ہی

کی کتابوں میں بعض ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جن سے بداندیش کی اس مہم میں شاید ناجائز نفع اٹھاتے ہوئے عوام کو مغالطوں کا شکار بنایا جا سکتا ہے۔

دل تو یہی چاہتا ہے کہ بداندیشی کا یہ جذبہ کبھی نہ ابھرے لیکن شیطان نے اس سوال کو اگر چھیڑ دیا تو انشاء اللہ تعالیٰ اس وقت آپ کو ان چند اوراق میں وہ سب کچھ مل جائے گا جو شاید بڑے سے بڑے کتب خانوں کے کتابی ذخیروں میں بھی نہیں مل سکتا، اسی وقت اس چھوٹی موٹی مختصری کتاب کی وقعت و قیمت کے صحیح اندازہ کا لوگوں کو موقع ملے گا اور وقت پر وہ تریاق انہی اوراق سے میسر آئے گا جو شاید اس کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا۔

تقریباً تیس چالیس سال کے مسلسل فکر، تامل، تلاش و جستجو کے آخری تحقیقی نتائج اس کتاب میں درج ہیں۔ جن لوگوں نے قرآن کے جمع و ترتیب کی متعلقہ روایتوں کا مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ کتنے فاحش اغلاط اور پیچ در پیچ ہمالیائی مغالطوں کے پہاڑوں کو کتنی آسانی کے ساتھ اڑا دیا گیا ہے۔ شکوک و شبہات کے سارے بادل پھاڑ دیئے گئے ہیں اور ناجائز نفع اٹھانے والوں کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی گئی ہے۔

حق تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ خاکسار کے رفیق محترم مولوی غلام ربانی ایم۔ اے (عثمانیہ) نے اس فقیر سراپا تقصیر کی جگر کاویوں اور دماغ سوزیوں کے ان نتائج کو بڑے پاکیزہ اسلوب اور دل نشین تعبیر میں اس کتاب کے اندر جمع کر دیا ہے۔ اگرچہ فقیر نے خود بھی اس عنوان پر مستقل کتاب لکھی ہے۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے میری کتاب کے اس ''جوہری خلاصہ'' کے شائع ہو جانے کے بعد اب اصل کتاب کی اشاعت کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی ہے، کیونکہ اس ضخیم و بسیط کتاب کے اکثر جوہری حقائق، اصولی مشتملات اس مختصر کتاب میں محفوظ ہو گئے ہیں، حق تعالیٰ مولوی غلام ربانی کی اس محنت کا

صلہ دین و دنیا میں عطا کرے، اسلام پر نازک ترین وقت کا خطرہ سامنے آ گیا ہے، دوسری چیزوں کے ساتھ مجھے امید ہے کہ اس نازک ترین گھڑی میں یہ مختصر رسالہ بھی ان شاء اللہ کافی کارآمد ثابت ہوگا، کم از کم اسلام کی اساسی کتاب جس پر اس دین کی "بنیاد" قائم ہے اس پر تو شک و شبہ کی گرد اچھالنے میں ان شاء اللہ تعالیٰ اب کوئی بداندیش کامیاب نہیں ہو سکتا۔

"وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَيَهْدِي السَّبِيْلَ"

کتبہ مناظر احسن گیلانی (گیلان) بہار

۱۵ ستمبر ۱۹۵۰ء

قرآن کا دوسری آسمانی کتابوں سے تعلق:

تاریخی طور پر اس کا متعین کرنا دشوار بلکہ ناممکن ہے کہ نسلِ انسانی کو پہلی کتاب خدا کی طرف سے کون سی، کہاں، اور کب ملی۔ قرآن کا اجمالی بیان یہ ہے کہ ہر امت میں نذیر اور خدا کے نمائندے آسمانی ہدایت کی تعلیم کے لیے آتے رہے اور جس طرح خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کی وحی ہوئی اسی طرح ان سے پہلے نوح علیہ السلام اور ان کے بعد انبیاء علیہم السلام پر ہوتی رہی۔ ارشادِ باری ہے:

"إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَٱلنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ بَعْدِهِۦ۔" (النساء: ۱۶۳)

ترجمہ: "ہم نے تم پر وحی اسی طرح کی جیسے نوح پر اور نوح کے بعد پیغمبروں پر وحی کرتے رہے۔"

اس سلسلے میں چند پیغمبروں کے نام لینے کے بعد یہ بھی فرمایا گیا ہے:۔

"وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَـٰهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ۔" (النساء: ۱۶۴)

ترجمہ: "ان پیغام لانے والوں میں سے بعضوں کا حال تم سے ہم نے بیان کیا

اور بعضوں کا حال نہیں بیان کیا ہے۔"

جس سے معلوم ہوا کہ انسانی زندگی کے نیک اور بد انجام کو علم وعمل کے نظام پہ مرتب کرنے کے لیے اور اس کی تشریح وتعلیم کے لیے پیغمبروں کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہا۔ پھر دوسری جگہ اس کی بھی تصریح ہے کہ:

"شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ۔" (شوریٰ:۱۳)

ترجمہ: "الدین (یعنی ایسا آئینی دستور جس پر زندگی کے دوسرے دور میں بدلہ دیا جائے اسی کو قانون بنا کر) جو تمہیں دیا گیا یہ وہی دین ہے جس کی وصیت خدا نے نوح علیہ السلام کو کی اور جس کی وحی ہم نے تم پر کی اور اسی کی وصیت ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو کی اور موسیٰ علیہ السلام کو بھی اور عیسیٰ علیہ السلام کو بھی (اسی کی وصیت کی گئی مقصد یہ تھا اور ہے) کہ اس الدین (اسی دستور کو) قائم کرو اور اس میں ٹکڑے مت۔"

ایک اور مقام پہ یہ فرمایا کہ:

"اَفَلَمْ یَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ یَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِیْنَ۔" (المومنون:۶۸)

ترجمہ: "کیا بات کو وہ سوچ نہیں رہے ہیں۔ یا ان کے پاس کوئی ایسی چیز آئی ہے جو ان کے آباء واولین (اگلے باپ دادوں کو) نہیں دی گئی تھی۔"

اس امر کو واضح الفاظ میں صاف کردیا گیا کہ انسانی زندگی کا قدرتی دستور العمل جس کی دین ومذہب کیش اور دھرم وغیرہ الفاظ سے لوگ تعبیر کرتے ہیں یہ انسانیت کا ایک

میں جمع ہوتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ان کتب مقدسہ کے پیش کرنے والوں کے اس تعدد و کثرت کو دیکھ کر غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ مذہب دنیا میں ایک نہیں بلکہ متعدد اور بہت ہیں۔

قرآن گزشتہ آسمانی کتابوں کا آخری ایڈیشن ہے:

بقول حضرت الاستاذ ایک ہی کتاب کو چند آدمی اگر کتب خانہ سے نکالیں تو چند لانے والوں کی وجہ سے یا وہی ایک کتاب کئی چند ہو جائے گی۔ یعنی کسی مصنف کی کتاب کے چند ایڈیشن کو دیکھ کر یہ فیصلہ کتنا غلط فیصلہ ہوگا کہ مصنف کی یہ ایک کتاب نہیں بلکہ چند کتابیں بن گئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن تمام آسمانی کتابوں کے ساتھ ٹھیک اسی نسبت کا مدعی ہے یعنی پچھلی ساری آسمانی کتابوں کا اپنے آپ کو وہ آخری اور مکمل ترین ایڈیشن قرار دیتا ہے اور قوموں کے پاس اس کتاب کے جو پرانے مشتبہ اور مشکوک یا ناقص وغیر مکمل نسخے رہ گئے ہیں ان کے متعلق اس کا صرف یہ مطالبہ ہے کہ اس جدید ترین اور کامل ایڈیشن سے مقابلہ کر کے قومیں اپنی موروثی کتابوں کی تصحیح کر لیں یہی اور صرف یہی ایک مطالبہ قرآن نے دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے اس مطالبہ کا مطلب کسی حیثیت اور کسی لحاظ سے بھی یہ نہیں ہے کہ دنیا کی قوموں کے پاس آسمانی دین اور مذہب اپنے آباؤ اجداد سے جو پہنچا ہے اس دین سے اور اس دین کا انتساب جن بزرگوں کی طرف ہے ان بزرگوں سے بے تعلق ہو کر قرآن کو بالکلیہ ایک جدید دین اور جدید کتاب کی حیثیت سے مانا جائے یقیناً قرآن کا نہ یہ مطالبہ ہے اور نہ قرآن کے نمائندوں کی طرف سے یہ دعوت دنیا کے سامنے کبھی پیش ہوئی۔ (۱)

(۱) اسی سے اندازہ کیجئے کہ [illegible] عثمان رضی اللہ عنہ [illegible]

= سے تھے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی سعادت ان کو حاصل ہوئی تو
انھوں نے عرض کیا کہ قرآن کے ساتھ تورات کی تلاوت بھی جاری رکھوں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا "اقرأ هذا ليلة وهذا ليلة" یعنی ایک رات قرآن پڑھا کرو اور ایک رات تورات۔ (تذکرۃ
الحفاظ للذہبی ص ۲۲ ج ۱) طبقات ابن سعد میں بھی ابوالجلد الجونی کے تذکرے میں لکھا ہے کہ سات
دن میں قرآن اور چھ دن میں تورات ختم کرنے کا عام دستور اپنے لیے انھوں نے مقرر کیا تھا اور ختم کے دن
لوگوں کو جمع کرتے تھے کہ اس دن رحمت نازل ہوتی ہے۔ (ابن سعد ج ۷ ص ۱۶۱) اور واقعہ بھی یہی ہے
کہ قرآن کی صحیح راہنمائی میں اس قسم کی کتابوں کے پڑھنے سے جہاں تک میرا ذاتی تجربہ ہے خود قرآن
کے سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ انجیل و تورات خیر ان کا تو پوچھنا ہی کیا، میں سنسکرت سے واقف نہیں ہوں لیکن
اردو میں اس کے بعض حصوں کا ترجمہ ہو گیا ہے اس کا ایک دن مطالعہ کر رہا تھا جو رگ وید کا ایک ٹکڑا تھا ایک
جگہ مجھے یہ فقرہ اس کتاب میں ملا: "یعنی اے اگنی تو خوبصورت بچہ ہے، پودوں میں سے نکالا ہوا، تاریکی
کو دور کرتا ہوا، ماؤں سے شور کرتا ہوا پیدا ہوا ہے۔" (ارچا ۱۴/۲۲/۱) کو پڑھتے ہوئے کچھ دیر بھی معلوم ہوتا
ہے لیکن جو واقعہ پیش آیا اس کا اظہار کرتا ہوں، اس اشلوک نے معاً میرے ذہن کو قرآن کی ان آیتوں کی
طرف منتقل کر دیا جن میں ارشاد ہوا ہے کہ "تم دیکھتے ہو اس آگ کو جسے تم پیدا کرتے یا نکالتے ہو، کیا تم
نے اس کے درخت کو اگایا، یا ہم ہیں اس کے اگانے والے۔" (الواقعہ) قریب قریب یہی مضمون سورۂ
یٰسین میں بھی ہے۔ عام مفسرین عرب کے بعض خاص درختوں کا ذکر کر کے لکھ دیتے ہیں کہ ان کی شاخوں
کو باہم رگڑ کر عرب آگ پیدا کرتے تھے اسی کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن رگ وید کا یہ طرز تعبیر قرآن کے طرز
تعبیر سے اس درجہ ملتا جلتا تھا کہ خیال گزرا کہ کیوں نہیں قرآن میں بھی "درخت" کو عام درخت سمجھ
جائے اور جیسے وید میں ہے کہ آگ خوبصورت بچہ ہے پودوں سے نکالا ہوا یعنی آگ کا ظہور لکڑی ہی کے
جلنے سے ہوتا ہے اور اسی سے شور کرتا ہوا پیدا ہوتا ہے، قرآن میں بھی کیا اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟

(۱۲ مناظر حسن گیلانی) (اس بحث سے متعلق ضروری نوٹ مقدمہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ عبدالحلیم)

کیا قرآن کسی کو اس کے آبائی اور موروثی دین سے جدا کرتا ہے؟

آج کروڑہا کروڑ کی تعداد میں مسلمان دنیا کے اکثر علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں یقیناً ان میں عیسائی، یہودی اور اسی قسم کے دوسری مذہبی امتوں کے لوگ بھی شریک ہیں۔ پھر کیا قرآن کو مان کر جو عیسائی تھے مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کی کتاب انجیل کی تکذیب کی، یا جو یہودی تھے مسلمان ہونے کے بعد موسیٰ علیہ السلام یا انبیاء بنی اسرائیل کی توہین کر رہے ہیں یا تورات اور تورات کے ساتھ دوسرے پیغمبروں کی جو کتابیں ہیں انہیں جھٹلا رہے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام کی تعلیم سے جو دور ہو گئے تھے قرآن شریف کو مان کر وہی عیسائی حضرت عیسیٰ اور ان کی صحیح تعلیم سے پھر قریب ہو گئے اور یہی حال ان ساری قوموں کے ساتھ پیش آیا ہے جو گزشتہ تیرہ ساڑھے تیرہ صدیوں میں قرآن کو مان مان کر اسلامی حلقے میں داخل ہوتی رہی ہیں یعنی اپنے آبائی اور موروثی دین کے جن اجزاء وعناصر کو لوگ کھو بیٹھے تھے یا تاریخی حوادث وواقعات نے ان کے دین کے جن حقائق ومسائل کو مشتبہ ومشکوک بنا کر رکھ دیا تھا۔ قرآن شریف کی راہ سے ان کھوئی ہوئی چیزوں کو انہوں نے پالیا اور شک وریب کی تاریکیوں میں جو باتیں رل مل گئی تھیں قرآن کی روشنی میں اب یقین کی آنکھوں سے دیکھنے اور پہچاننے میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ بس حقیقت یہی ہے کہ اپنے آباء اولین اور گزشتہ باپ دادوں کے دین سے قرآن پاک کو مان کر قطعاً کوئی الگ نہیں ہوا ہے بلکہ جو الگ ہوئے تھے بلا خوف تردید دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے آبائی دین ہی کی طرف خدا کی اس آخری کتاب نے ان سب کو واپس کر دیا ہے۔ اس نے توڑا نہیں ہے بلکہ جو ٹوٹے ہوئے تھے ان کو اپنے بزرگان سلف اور

ان کی سچی تعلیم صحیح زندگی کے ساتھ جوڑ دیے ہیں۔ واقعہ یہی ہے خواہ دنیا اسے مانے یا نہ مانے قرآن کی دعوت و تبلیغ کا یہی محوری نصب العین ہے۔ بکھری ہوئی منتشر اور پراگندہ انسانیت کو اسی راہ سے وحدت و وفاق کے مرکزی نقطہ پر دوبارہ "سمیٹ کر" لے آنا چاہتا ہے۔

بہرحال یہ تو ایک تمہیدی ذیلی گفتگو تھی، میں آپ کے سامنے اس موروثی دین کی الٰہی کتاب کے آخری ایڈیشن کے ان پہلوؤں کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جن کے متعلق بحثیں سے پیدا ہوئیں یا غرض مند خواہ مخواہ بعض بے بنیاد منادی دو با مختلف زاویوں سے اُٹھ پڑے ہیں۔ یعنی قرآن مجید کی تدوین یا جمع و ترتیب کی جو واقعی سرگزشت ہے اسی کے متعلق ایک مختصر اور سادہ بیان ان لوگوں کے سامنے پیش کر رہا ہوں جو ناواقفیت کی وجہ سے ان ہی اوہام سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں یا آئندہ مبتلا کیے جا سکتے ہیں۔

قرآن کی تدوین کی مصدقہ شہادتیں:

قرآن کی تدوین یا جمع و ترتیب کے متعلق سوالوں پر جن شہادتوں سے روشنی پڑ سکتی ہے آسانی کے لیے ہم ان شہادتوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ یعنی شہادتوں کا ایک سلسلہ تو وہ ہے جو خود اس کتاب کے اندر پایا جاتا ہے۔ ہم اندرونی شہادتوں سے ان کی تعبیر کر سکتے ہیں اور دوسرا سلسلہ ان تاریخی روایات کا ہے جن سے اس کتاب کے تدوینی حالات جاننے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے، ہم ان کو بیرونی شہادتوں سے موسوم کریں گے۔ پہلے ہم اندرونی شہادتوں کو پیش کرتے ہیں۔

اندرونی شہادتیں:

واقعہ یہ ہے کہ اس لحاظ سے دنیا کی ان تمام کتابوں میں جنھیں قومیں خدا کی طرف منسوب کرتی ہیں شاید قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جو اپنے متعلق سوالات کے جوابات کے لیے قطعاً خود کفیل ہونے کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخی روایات کا جو ذخیرہ قرآن کے جمع و ترتیب کے متعلق پایا جاتا ہے اگر یہ ذخیرہ نہ بھی پایا جاتا جب بھی اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کے متعلق سوالات کے جوابوں کو ہم خود قرآن ہی میں پا سکتے ہیں۔

اس کتاب کا نازل کرنے والا کون ہے؟ کس پر نازل ہوئی؟ کس لیے نازل ہوئی؟ کیا صرف ان ہی بنیادی سوالوں کے جوابات جیسا کہ ہر قرآن پڑھنے والا جانتا ہے اس کتاب میں جگہ جگہ موجود نہیں ہیں حالانکہ اس نوعیت کی دوسری کتابوں میں اگر کوئی چاہتا ہے تو انصاف سے بتایا جائے کہ ان سوالوں کا جواب خود ان کتابوں میں کوئی پا سکتا ہے؟ چونکہ قرآن کی یہ عام باتیں ہیں اس لیے ان سوالوں پر بحث کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے قرآن کی اندرونی شہادتوں کی روشنی میں اس وقت صرف حسب ذیل سوالوں کے جوابوں کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ ابتدائی حالت اس کتاب کی کیا تھی؟ بالفاظ دیگر میرا مطلب یہ ہے کہ جیسے عموماً خدا کی طرف منسوب ہونے والی دوسری کتابوں کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً زبانی یادداشتوں اور گیتوں اور بھجنوں کی شکل میں وہ رہیں اور صدیوں بعد وہ قلمبند

ہوئیں۔(۱) اس باب میں قرآن کا کیا بیان ہے؟

بقول مولانا گیلانی اس سوال کے حل کے لئے اوراق الٹنے کی بھی ضرورت نہیں بلکہ سورۃ فاتحہ کے بعد قرآن کی پہلی سورۃ بقرہ ہی کی پہلی آیت "ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ" (یہ ایک نوشتہ ہے جس میں شک نہیں ہے) اسی فقرہ میں اس سوال کا جواب آپ کو مل جائے گا یعنی خود کتاب کا لفظ جس کے معنی نوشتہ اور لکھی ہوئی چیز کے ہیں۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ پیش کرنے والا ابتداء ہی سے اس کو نوشتہ اور مکتوب شکل ہی میں پیش کرنا چاہتا ہے اور کتاب یا نوشتہ کا یہ لفظ کچھ اسی مقام پر مستعمل نہیں ہوا ہے۔ قرآن پڑھیے تقریباً ہر بڑی سورت میں کتاب یا نوشتہ ہونے کی اسی تعبیر کا مسلسل ذکر آپ کو ملتا چلا جائے گا۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ کفار عرب کا یہ فقرہ جو قرآن میں نقل کیا گیا ہے یعنی وہ کہا کرتے تھے کہ

"اِكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا" (الفرقان ۵)

ترجمہ: "لکھوا لیا ہے اس شخص نے (یعنی پیغمبر نے) اس کو (یعنی قرآن کو) پس

---

(۱) حد یہ ہے کہ اس سلسلے میں کتابوں کے جس مجموعے کو دنیا کا قدیم ترین مجموعہ سمجھا جاتا ہے یعنی ہمارے ملک کی آریہ قوم کی مذہبی کتاب وید اس کے متعلق آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ قرآن مجید جو اس سلسلے کی آخری کتاب ہے اس کے پانچ سو سال بعد قلمبند ہوئی۔ البیرونی جو ۱۱ویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا تھا اس کا بیان ہے کہ اس کی آمد سے کچھ دن پہلے ایک کشمیری پنڈت نے وید کو کتابی قالب عطا کیا ورنہ اس سے پہلے سینہ بسینہ برہمنوں کا ایک خاص طبقہ اس کو زبانی یاد کرتا چلا آرہا تھا۔ (دیکھو کتاب "ہندوستان کے ازمنہ وسطیٰ کی معاشرت و اقتصادی حالت" از عبداللہ یوسف علی۔ صفحہ ۱۰۱) [illegible] نے اپنی کتاب "ہندی فلسفہ" میں لکھا ہے کہ ویدوں کے قلمبند کرنے کو ایک مدت تک کفر سمجھا جاتا تھا۔ برہمن اپنے استادوں سے سن کر زبانی یاد کرتے تھے اسی لیے اس کا نام "شرتی" تھا۔ (دیکھو "ہندی فلسفہ" ش۔ ص ۱۹۔ مترجمہ مولوی محمد حمید بادامی)

وہی پڑھا جاتا ہے اس پر صبح شام۔"

اس سے پتہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی کتابت اور نوشتگی ایک عام اور پھیلی ہوئی بات تھی جسے وہ بھی جانتے تھے جنہوں نے اب تک اس کو خدا کی کتاب بھی نہیں مانا تھا۔

ماسوا اس کے اس کتاب یا نوشتے کے متعلق اس قسم کے ذیلی سوالات یعنی قرآن کس چیز پر لکھا جاتا تھا۔ پیغمبر تو خود امی تھے لکھنے پڑھنے سے ناواقف تھے پھر کن لوگوں سے اس کو لکھواتے تھے آپ چاہیں تو ان سوالات کے جوابوں کو بھی قرآن ہی میں تلاش کر سکتے ہیں۔ مثلاً پہلا سوال یعنی قرآن کس چیز پر لکھا جاتا تھا۔ اس کے لئے قرآن میں ہی پڑھیے:۔

"وَالطُّوْرِ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (۱)" (والطور: ۱)

ترجمہ: "قسم ہے (کوہ) طور کی اور لکھی ہوئی کتاب کی جو باریک جھلی کھلی ہوئی پڑی ہوئی ہے۔"

جیسا کہ معلوم ہے کہ "رق" ایک خاص قسم کی باریک جھلی کو کہتے ہیں جو لکھنے کے کام کے لیے تیار کی جاتی تھی انگریزی میں جسے پارچمنٹ (PARCHMENT) کہتے ہیں اور قدیم زمانے کی تورات، انجیل وغیرہ جیسی کتابیں اسی پر لکھی ہوئی اب بھی ملتی ہیں۔ قرآن یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی کتابت بھی "رق" ہی پر ہے۔ اسی طرح اس کی خبر دیتے ہوئے کہ قرآن تو چونک پیدا کرنے والی ایک چیز ہے اسی کی صفت میں فرمایا گیا ہے کہ۔

(۱) تفسیر فتح البیان ج:۹ ص:۳۸ میں دیکھیے کہ کتاب مسطور جو رق منشور میں لکھی ہوئی ہے اس سے مراد قرآن ہے۔ ۱۲

"فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ بِأَيْدِيْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ." (عبس۔۱۳،۱۴،۱۵،۱۶)

ترجمہ: "صحیفوں میں لکھا ہوا ہے ایسے صحیفے جو مکرم و محترم ہیں پاک ہیں لکھے ہوئے ہیں ہاتھوں سے ان لکھنے والوں کے جو بڑے بزرگ اور پاکباز لوگ ہیں۔"

جس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوا کہ قرآن صحیفوں میں لکھا جارہا تھا بلکہ اس کے لکھنے والوں کی ان اعلیٰ خصوصیات کا بھی اظہار کیا گیا ہے جن میں صحت نویسی کی ضمانت پوشیدہ ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ قرآن کے پڑھنے والے اس قسم کی آیتیں پڑھتے ہیں۔ مثلاً:۔

"لَا يَمَسُّهٗ إِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ." (الواقعہ:۷۹)

ترجمہ: "نہیں چھوتے ہیں اس کو (یعنی قرآن کو) مگر وہی لوگ جو پاک ہوں۔"

مگر نہیں سوچتے کہ زبانی یادداشت کی شکل میں جو چیز ہوگی کسی حیثیت سے بھی کیا یہ حکم یعنی مس اور چھونے کی ممانعت کا تصور اس کے متعلق کیا جا سکتا ہے جس کے صاف معنی یہی ہیں کہ خود قرآن نے اپنے آپ کو ایک نوشتہ اور مکتوب شکل میں پیش کیا ہے جس کے مس اور چھونے جانے کا بھی امکان تھا ورنہ ممانعت یقیناً ایک بے معنی سی بات ہو جاتی ہے۔

علاوہ اس کے تدریجی نزول یعنی وقفہ وقفہ سے قرآنی آیتیں جو اتر رہی تھیں اور "جُمْلَةً وَّاحِدَةً" (الفرقان:۳۲) یعنی ایک ہی دفعہ ان کو نازل نہیں کیا گیا اس کی وجہ جو یہ بیان کی گئی ہے کہ:

"لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ" (الفرقان:۳۲)

ترجمہ: "تاکہ ہم جمائیں اس کے ساتھ تیرے دل کو۔"

ظاہر ہے کہ قرآن کو دل میں جمانے یعنی یاد کرنے میں خود پیغمبر کو نزول کے اسی تدریجی طریقہ سے بسہولت موقع مل سکتا تھا۔ پھر سورۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ:

"وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ." (الاسراء:۱۰۶)

ترجمہ: "قرآن (جس کی آیتوں کو) جدا جدا کر کے ہم نے اتارا (یا اس لئے کیا گیا) تاکہ لوگوں پر وقفہ کے ساتھ اس کتاب کو تم پڑھو۔"

اس تدریجی نزول کی وجہ یہ بھی جو بیان کی گئی کہ لوگوں کے سامنے وقفہ وقفہ سے پڑھنے کا موقع اسی طرح مل سکتا ہے گویا علاوہ پیغمبر کے دوسرے لوگوں کو بھی قرآن شریف کے زبانی یاد کرانے کی بھی تدبیر ہو سکتی تھی اس تدبیر میں جو کامیابی ہوئی اس کی خبر دیتے ہوئے قرآن ہی میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ:

"بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ." (عنکبوت:۴۹)

ترجمہ: "بلکہ وہ (یعنی قرآن) تو کھلی ہوئی واضح آیتوں کا (مجموعہ ہے) جو ان لوگوں کے سینوں میں ہے جنہیں علم دیا گیا ہے۔"

مطلب یہی ہوا کہ علاوہ کتابی قالب میں محفوظ ہونے کے صحابیوں میں اہل علم کا جو طبقہ تھا قرآن اطلاع دیتا ہے کہ ان کے سینوں میں بھی وہ محفوظ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ نیز سورۂ مزمل کے آخری رکوع میں:

"فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ." (المزمل:۲۰)

ترجمہ: "پس پڑھو تم لوگ جتنا آسانی سے ہو سکے قرآن کو۔"

کے حکم کو نافذ کرتے ہوئے اس واقعہ کا تذکرہ قرآن ہی میں کیا گیا ہے کہ تنہا پیغمبر ہی نہیں بلکہ پیغمبر کے صحابیوں کا ایک جتھا اور گروہ بھی:

"اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ." (المزمل: ۲۰)

ترجمہ: "رات کے دو تہائی یا آدھے یا تہائی حصہ میں۔"

کھڑے ہوتے ہیں اور قرآن کو دہراتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے متعلق:

"يَتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ." (آل عمران: ۱۳)

ترجمہ: "پڑھتے ہیں اللہ کی آیتوں کو رات اور دن کے وقت میں۔" (۱)

وغیرہ آیتوں میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ صبح و شام ان کا شغل اپنے یاد کیے ہوئے قرآن کا اعادہ اور تکرار تھا۔

قرآن کی اندرونی شہادتوں کے بعد کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کتاب کی حفاظت کا سامان کتابۃً وحفظاً یعنی لکھ کر اور زبانی یاد کرکے جو کیا گیا تھا اس کے لئے کسی بیرونی شہادت کی ضرورت ہے؟ خود قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت خود ہی کتاب کے محفوظ کرنے کا سامان اس حد تک کرچکی تھی کہ دوسری آسمانی کتابوں کے ساتھ مختلف حوادثات وواقعات جو پیش آتے رہے ان کا قطعی طور پر شروع ہی سے انسداد کردیا گیا تھا۔ سورۃ البروج میں ہے:

"هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ." (البروج: ۱۸)

ترجمہ: "کیا تمہارے پاس جتھوں کی خبر پہنچی ہے یعنی فرعون اور ثمود کے جتھوں

---

(۱) اصل کتاب میں یوں تھا "يتلون آيات الله بالليل والنهار" (پڑھتے ہیں اللہ کی آیتوں کو رات میں بھی اور دن میں بھی) لیکن ان الفاظ کے ساتھ آیت قرآن میں نہیں ہے لہذا اس کو بدل دیا گیا۔ عبدالحلیم

کی۔"

اس سوالیہ فقرے کے بعد قرآن ہی میں اس دعوے کا اعلان کیا گیا یعنی:

"بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ." (البروج ۲۱)

ترجمہ: "بلکہ وہ تو بلند و بالا قرآن ہے لوح محفوظ میں۔"

بقول مولانا گیلانی اس کا بظاہر یہی مطلب ہوتا ہے کہ فرعون و ثمود جیسی قوموں کی سی جبار حکومتوں کی طاقت بھی قرآن کو غیر محفوظ کرنے کی کوشش کسی زمانہ میں بھی خدانخواستہ اگر کرے گی تو ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ تیرہ سو سال سے قرآن کے اس دعوے کی جو دوست نہیں ہیں، وہ بھی تصدیق کر رہے ہیں۔

"ہم قرآن کو محمد کا کلام اسی طرح یقین کرتے ہیں جس طرح مسلمان اس کو خدا کا کلام یقین کرتے ہیں۔" (اعجاز التنزیل ص: ۵۰۰)

یہ ایک غیر مذہب کے آدمی "وان ہیم" (جرمنی) کا ایسا منصفانہ اعتراف ہے کہ جو قرآن کی تاریخ سے تھوڑی بہت بھی واقفیت رکھتا ہے، خدا کا کلام اس کو تو بھی مانے لیکن "وان ہیم" نے جو بات کہی ہے اس کے اعتراف و اقرار پر تو اپنے آپ کو وہ بہرحال مجبور پائے گا۔

ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت:

واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کتاب کو جن خصوصیتوں کے ساتھ دنیا کے حوالے کیا تھا ابتداء سے اس وقت تک بغیر ادنیٰ تغیر و تبدل اور سر مو تفاوت کے وہ اسی طرح نسلاً بعد نسلٍ کروڑہا کروڑ مسلمانوں میں اس طریقہ سے منتقل ہوتی ہوئی چلی

سے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جیسے قرآنی اجزاء کے جمع رکھنے کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے لی ہے اسی طرح اس کتاب کے پڑھنے پڑھانے کا ذمہ دار بھی وہ خود ہی ہے۔ آگے سوال ہو سکتا تھا کہ پڑھنے والے بھی باقی رہیں لیکن سمجھنے اور سمجھانے والے غائب ہو جائیں تو اس وقت بھی کتاب کا افادہ ختم ہو جائے گا جیسے آج مثلاً وید کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ اس کی زبان اتنی پرانی ہو چکی ہے کہ لغت کی مدد سے بھی اس کا سمجھنا مشکل ہے۔(۱)

اسی وسوسہ کی ضمانت اللہ تعالیٰ کے قول:۔

"ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ" (القیمہ:۱۸)

ترجمہ: "پھر ہم ہی پر ہے اس کا بیان بھی۔"

کے الفاظ میں آپ پا سکتے ہیں۔ آخر جس کتاب کے معانی و مطالب کے بیان و تشریح کی ذمہ داری اس خدا نے لی ہو جس کا وجود ماضی و حال و مستقبل سب سے مساوی تعلق رکھتا ہے تو کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ اپنی اس ذمہ داری کو تاریخ کے ہر دور میں کیوں پوری نہ فرمائے گا؟ قرآن سے یہی سمجھ آتا ہے اور یہی دیکھا بھی جا رہا ہے کہ ہر زمانہ کے اقتضاء کے مطابق قرآنی معانی و مطالب کی تشریح و تعبیر کرنے والے مسلسل چلے آ رہے ہیں۔ دراصل انہی تفصیلات کا اجمالاً ذکر قرآن کی مشہور آیت میں فرمایا گیا ہے جسے عموماً مولوی اپنے وعظوں میں لوگوں کو سناتے ہی رہتے ہیں۔ یعنی۔

"إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ" (الحجر:۹)

---

(۱) پنڈت ستیہ رام لال جی اپنی مشہور کتاب "گیتا اور قرآن" میں ویدکا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی (یعنی وید کی) زبان اتنی پرانی اور عجیب ہے اور ایک ایک منتر کے اتنے اتنے ارتھ لگائے جا سکتے ہیں کہ سب پڑھے لوگوں کے لئے نہیں بلکہ ودوانوں (علماء) کے لئے بھی ہزاروں برس سے یہ ایک پہیلی رہا ہے اور ہمیشہ پہیلی ہی رہے گا۔ (ص ۹۹ کتاب مذکور کا اردو ایڈیشن)

ترجمہ: ''ہم ہی نے اس ذکر (چونکا دینے والی کتاب) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

بہرحال بیرونی شہادتوں سے اگر قطع نظر بھی کر لیا جائے تو قرآن کی اندرونی شہادتوں ہی سے ان سارے سوالوں کے جوابوں کو ہم حاصل کر سکتے ہیں جو قرآن جیسی کسی کتاب کے متعلق دلوں میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

قرآن میں نوشت وخواند سے متعلق الفاظ:

اتفاق یہ ہے کہ قرآن کے عہد نزول میں عرب کے ماحول کی جو نوعیت نوشت وخواند کے لحاظ سے تھی عرب کی صحیح تاریخ کا جنہوں نے مطالعہ نہیں کیا ہے نیز قرآن ہی کی ایک اصطلاح یعنی لفظ ''جاہلیت'' کے اصطلاحی معنی سے واقف ہونے کی وجہ سے بعض لوگ اس مغالطہ میں جو مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جاہلیت کیا! اس دور میں قرآن کی کتابت کے امکان کی صورت ہی کیا تھی؟ انہوں نے باور کر لیا ہے کہ عرب میں نہ لکھنے والے پائے جاتے تھے اور نہ لکھنے پڑھنے کا سامان اس وقت اس ملک میں موجود تھا مگر کاش معترضین کا یہ گروہ صرف قرآن ہی کا مطالعہ کر لیتا تو اس کتاب میں بار بار رق، قرطاس، صحیفہ، صحف،(1) قلم، زبر، الواح، مداد (روشنائی)، اسفار، کتب وغیرہ، الغرض ایسی ساری چیزیں جن کا عموماً نوشت وخواند سے تعلق ہے۔ ''ان کے ذکر سے قرآن پاک آپ کو لبریز نظر آئے گا۔ اور یہ تو لکھنے پڑھنے کے سامان کا حال ہے، باقی رہا لکھنے والے، سو حیرت ہوتی ہے کہ عرب کے

(1) رق، قرطاس، صحیفہ، صحف ان چاروں الفاظ سے وہ اوراق سمجھ میں آتے تھے جن پر اس عہد میں لوگ لکھتے تھے، جو عموماً باریک کھالوں سے بنائے جاتے تھے۔۱۲

اس زمانے کے باشندوں کی طرف قرآن ہی میں:

"يكتبون الكتب بأيديهم ثم يقولون هذا من عند الله۔"

(البقرہ: ۷۹)

ترجمہ: ”لکھتے ہیں وہ لوگ کتاب اپنے ہاتھوں سے اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کے پاس سے آئی ہوئی کتاب ہے۔“

پڑھتے ہیں پھر لین دین کے جس قانون کا طویل بیان سورۂ بقرہ کے آخر میں پایا جاتا ہے اور تاکید کے ساتھ قرضی معاملات کے لکھنے کا امر قرآن نے جو کیا ہے سوچنا چاہیے کہ ان امور کا انتساب ان لوگوں کی طرف کس حیثیت سے بھی صحیح ہو سکتا ہے جو نوشت و خواند سے قطعاً بیگانہ اور ناآشنا ہوں۔“

قرآن میں جاہلیت کے معنی:

رہا جاہلیت کا لفظ سو میں بیان کر چکا ہوں کہ یہ قرآن کی بنائی ہوئی اصطلاح ہے، متعدد مقامات پر اس نے اپنی اس اصطلاح کو استعمال کیا ہے۔ مثلاً مردوں اور عورتوں کی مخلوط سوسائٹی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:۔

"ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولى۔" (الاحزاب: ۳۳)

ترجمہ: ”اور نہ بناؤ سنگھار کرو جاہلیت اولیٰ والوں کے بناؤ سنگھار کی طرح۔“

(۱) اسی جاہلیت کا مشہور لطیفہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو عرب کے مضری قبیلہ سے نسلی تعلق رکھتے تھے، جب آپ کے مقابلہ میں مضری قبیلے کے دوسرے حریف عربی قبیلے ربیعہ کے ایک آدمی مسیلمہ نے بھی نبوت کے دعوے کا اعلان کر دیا تو لکھا ہے کہ ”مضر والوں کے نبی سے ربیعہ کا ایک مرد از مسیلمہ (جو ان ہے)

یہ عرب پر "نسلی ولسانی" اور وطنی عصبیتوں کا جو بھوت سوار تھا۔ (۱) اس کی تعبیر "حمیۃ الجاھلیۃ" سے کی گئی ہے یا خدا کے متعلق ارتیابی (ایک با شک) ذہنیت عام عربوں پر جو مسلط تھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا۔

"یظنون باللہ غیر الحق ظن الجاھلیۃ۔" (آل عمران: ۱۵۴)

ترجمہ: "اور خیال رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ جاہلیت کے خیالات۔"

اب آپ ہی بتایئے کہ کسی جگہ بھی "جاہلیت" کے اس لفظ سے وہ مطلب سمجھا جاتا ہے جو اس زمانے کے جاہلوں اور ناواقفوں نے سمجھ رکھا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کے مقابلے میں عربوں کی غیر اسلامی زندگی اخلاقاً اعتقاداً جو کچھ بھی تھی اور جن خصوصیتوں کی حامل تھی دراصل اسی کی تعبیر قرآن جاہلیت سے کرتا ہے۔ بہرحال یہ بات کہ اسلام سے پہلے نوشت وخواند سے عرب کے لوگ چونکہ ناواقف تھے اس لئے ان کے زمانہ کو قرآن جاہلیت کا زمانہ قرار دیتا ہے، یہ وہی کہہ سکتا ہے جو قرآن سے بھی جاہل ہے

= کے پاس آئے۔ گفتگو کے بعد طلحہ نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو (مسیلمہ) جھوٹا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ طلحہ نے کہا کہ ربیعہ کا کذاب (جھوٹا) مضر کے صادق (راست باز) سے مجھے زیادہ محبوب ہے۔ اس کے بعد مسیلمہ کے رفقاء میں شریک ہو گیا۔ (ص ۲۸۶ ہجری ج ۳ طبع دار المعارف مصر ۱۹۶۰) مسیلمہ کے دعوے کی بنیاد قومی عصبیت اور عصبیت پر تھی۔ اس کا پتہ ان فقروں سے بھی چلتا ہے جو قرآن کے مقابلہ میں شعر بنایا کرتا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے سنانے والے نے سنایا تھا کہ مسیلمہ یہ بھی کہتا تھا "یاضفدع نقی نقی لا الشارب تمنعین ولا الماء تکدرین لنا نصف الارض ولقریش نصف الارض ولکن قریشا قوم معتدون" (اے مینڈک کی بچی تو نہ پانی پینے والوں کو روکتی ہے اور نہ پانی کو گدلا کرتی ہے) مطلب یہ ہے کہ آدھی زمین ہماری یعنی ربیعہ والوں کی اور آدھی قریش کی مگر قریش تو زیادتی سے کام لیتے ہیں۔ (ص ۳۰۰ ج ۳ طبری)

اور ایام جاہلیت کی تاریخ سے بھی۔

بیرونی شہادتیں:

قرآن کی ان اندرونی شہادتوں کے اجمالی بقدر ضرورت تذکرہ کے بعد اب میں بیرونی شہادتوں کی طرف پڑھنے والوں کی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں۔ اس موقع پر سب سے پہلے شیعی فاضل "علامہ طبری" کے خیالات کا پیش کرنا مناسب ہوگا انہوں نے اپنی تفسیر "مجمع البیان" میں لکھا ہے اور بالکل صحیح لکھا ہے۔

"إن العلم بصحة نقل القران کالعلم بالبلدان والحوادث الکبار والوقائع العظام والکتب المشهورة." (مقدمہ روح المعانی، ج۱، ص:۲۴ طبع مکتبہ امدادیہ ملتان پاکستان)

ترجمہ: "یعنی قرآن اپنی اصلی حالت کے ساتھ گزشتہ نسلوں سے منتقل ہوتے ہوئے پچھلی نسلوں تک پہنچا ہے، اس واقعہ کے علم کی نوعیت وہی ہے جو بڑے بڑے شہروں یا مشہور حوادث اور اہم تاریخی واقعات یا مشہور کتابوں کے علم کی ہے۔"

بلاشبہ واقعہ یہی ہے، آج نیویارک اور لندن کے وجود میں شبہ یا شک جیسے جنون ہے یا جنگ عظیم کے حادثہ کا منکر پاگل سمجھا جائے گا۔ یقیناً متواتر اور متوارث ہونے میں بجنسہ یہی حال قرآن مجید کا بھی ہے، یہ ایک واقعہ ہے کہ تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال کی اس طویل مدت میں ایک لمحہ کے لئے نہ مسلمان ہی اس کتاب سے جدا ہوئے اور نہ یہ کتاب ہی مسلمانوں سے جدا ہوئی جسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سپرد کرکے دنیا سے تشریف لے گئے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جن مسلمانوں کے سپرد اس کتاب کو کیا تھا، ان کی تعداد

لاکھوں سے متجاوز تھی پھر ان ہی لوگوں نے اپنی بعد کی نسلوں تک اسے پہنچایا جن کی تعداد بلا مبالغہ کروڑوں سے بھی آگے بڑھ چکی تھی اور یونہی طبقۃ بعد طبقۃ نسلاً بعد نسلٍ نوشتہ ومکتوبہ شکل میں یہ کتاب مسلمانوں میں منتقل ہوتی چلی آرہی ہے، پس یہی بات یہی ہے کہ قرآن تو قرآن ایسی کتابیں جیسے نحو میں "سیبویہ" کی یا اصول میں "المزنی" کی کتاب ہے بقول "علامہ طبرسی" کے:۔

"لو ان مدخلا ادخل فی کتاب سیبویہ بابا من النحو لیس من الکتاب لعرف وکذا القول فی کتاب المزنی۔"

(روح ص:۲۴، ج:۱)

ترجمہ: "اگر سیبویہ اور مزنی کی کتابوں میں کوئی شخص اپنی طرف سے کسی چیز کو داخل کر دے تو فوراً یہ بات پہچان لی جائے گی۔"

تو پھر قرآن میں اضافہ یا کمی کے امکان کی بھلا کیا صورت ہے، اسلامی ممالک کے کسی ابتدائی مکتب کا ایک بچہ بھی اس شخص کو ٹوک سکتا ہے جو فتحہ (زبر) کی جگہ کسی حرف کا رفع (پیش) کے ساتھ پڑھے گا، جس کا جی چاہے اس کا تجربہ ہر جگہ کر سکتا ہے۔

تواتر اور توارث کے اسی عام قصہ کے سوا قرآن کے جمع و ترتیب کے سلسلہ میں بیرونی روایتوں کا جو ذخیرہ پایا جاتا ہے میرے نزدیک ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حصہ تو ان روایتوں یا شہادتوں کا ہے جن سے قرآن کے بعض اجمالی بیانات یا شہادتوں کی شرح ہوتی ہے۔ ہم پہلے انہی کا ذکر کرتے ہیں۔

تشریحی روایات :

مطلب یہ ہے کہ قرآنی آیات کا نزول وقتاً فوقتاً جو ہوتا رہا آپ سمجھتے ہیں۔ یہ خود قرآن کا دعویٰ ہے اور ایک سے زائد مقام پر اس دعوے کا ذکر خود قرآن ہی میں کیا گیا ہے۔ اس دعوے کی تفصیل روایتوں میں یہ ملتی ہے کہ قرآن کی ایک سو چودہ (۱۱۴) سورتوں کی حیثیت دراصل مستقل کتابوں یا رسالوں کی قرار دی گئی تھی۔ جیسے ان کو یوں سمجھئے کہ تاریخ، فلسفہ، الٰہیات، طب اور جغرافیہ وغیرہ مختلف علوم و فنون کی کتابوں کو ایک ہی مصنف اگر تصنیف کرنا شروع کرے اور تصنیف میں یہ طریقہ اختیار کرے کہ جس کتاب کا جو مواد فراہم ہوتا جائے اسی متعلقہ کتاب میں درج کرتا چلا جائے اور یوں آہستہ آہستہ دس بیس برس میں آگے پیچھے اس کی یہ ساری تصنیفیں ختم ہوں، تو یہی کیفیت قرآنی سورتوں یا ان مستقل رسالوں کی ہے۔(۱) جن کے مجموعہ کو ہم قرآن کہتے ہیں۔

---

(۱) قرآن ہی میں ایک جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف کرتے ہوئے یہ جو فرمایا گیا ہے "رَسُولٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ" (البینة: ۲۰۳) (اللہ کی طرف سے پیامبر آئے ہیں، پڑھتے ہیں پاک صحیفوں کو جن میں استوار اور مضبوط نوشتے ہیں) تو ظاہر ہے اس میں "الکتب" کے لفظ کو "کتاب" کی جمع قرار دینا لغت کی خلاف ورزی نہیں ہے اور مراد ان سے قرآن کی انہی مستقل کتابوں یا رسالوں سے ہو جنہیں ہم اصطلاحاً قرآن کی سورتیں کہتے ہیں تو انکار کی کیا کوئی معقول وجہ ہو سکتی ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ صحف میں کتب ہونے کی ترکیب میں لوگوں نے جو دشواریاں پیدا کرکے طرح طرح کی دور از کار توجیہیں کی ہیں ان کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی صرف سیدھا ترجمہ یہ ہو جاتا ہے کہ پاک اوراق جن میں مستقل اور مستحکم کتابیں یعنی سورتیں لکھی ہوئی ہیں۔ ۱۲ (مناظر احسن گیلانی)

بتدریج تئیس (۲۳) سال میں ان سب کے نزول کا سلسلہ ختم ہوا۔ ان سورتوں میں کوئی سورة اختتام تک پہلے پہنچی، اور کوئی بعد میں۔ یہی مطلب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ کا ہے جو ابوداؤد، نسائی اور ترمذی وغیرہ میں پائے جاتے ہیں، آپ نے فرمایا:۔

"ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان مما يأتي عليه الزمان ينزل عليه السور ذات العدد." (مختصر کنز العمال بر حاشیہ مسند احمد ج ۲، ص ۴۸ طبع المکتب الاسلامی بیروت طبع چہارم ۱۹۸۵ء)

ترجمہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر متعدد سورتیں اترتی رہتی تھیں یعنی ایک ہی زمانہ میں مختلف سورتوں کے نزول کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔"

اسی روایت میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ ذوات العدد (متعدد) سورتیں تدریجی طور پر جو نازل ہوتی تھیں ان کے لکھوانے اور قلم بند کرانے کا طریقہ یہ تھا:۔

"و كان اذا نزل عليه الشئ يدعو بعض من كان يكتب عنده فيقول ضعوا هذا في السورة التي يذكر فيها كذا و كذا." (۱) (مختصر کنز العمال: ۲/ص:۴۸)

ترجمہ: "جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی چیز نازل ہوتی تو جو لکھنا جانتے تھے ان میں سے کسی کو آپ طلب فرماتے اور کہتے کہ اس آیت کو اس سورة میں لکھو

---

(۱) ابوداؤد، ج:۱، ص:۳۵۰ (تحقیق: الدین ہزام، بیروت ۱۹۹۸ء)، ترمذی، ج:۵، ص:۲۹۰ (طبع دار الغرب الاسلامی، تحقیق بشار عواد)، مستدرک حاکم، ج:۲، ص:۲۲ (دار المعرفہ، بیروت ۱۹۹۸ء)۔ عبدالقیوم

جس میں فلاں فلاں باتیں یا آیتیں ہیں۔" (۱)

مطلب وہی ہے کہ طب کے متعلقہ مضامین کو طب کی کتاب میں اور تاریخ کے مواد کو تاریخ کی کتاب میں مذکورہ بالا طریقہ سے تصنیف اختیار کرنے والا مصنف جیسے داخل کرتا چلا جاتا ہے اسی طرح قرآنی آیات کو ان کی متعلقہ سورتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شریک کرنے کا حکم دیا کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم جبرئیل علیہ السلام دیتے تھے۔

جیسا کہ معلوم ہے خود قرآن ہی سے:

"ولا تخطه بیمینک۔" (عنکبوت۔ ۴۸)

ترجمہ: "اور نہ لکھا ہے اس کو تم نے اپنے ہاتھ سے۔"

کی خبر دیتے ہوئے اس کا انکشاف کیا ہے کہ صاحب انی صلی اللہ علیہ وسلم لکھنا نہیں جانتے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نہیں بلکہ اپنے صحابیوں میں سے چالیس سے اوپر حضرات کو اس کام کے لئے مقرر کر رکھا تھا کہ جس وقت قرآن کی جس سورۃ کی جن آیتوں کی وحی ہو فوراً پہنچ کر ان کو لکھوا کریں۔ "العراقی" نے "منظومہ" سیرت میں ان کاتبوں کے نام گناتے ہوئے نظم کی ابتدا اسی مصرعہ سے کی ہے۔

---

(۱) اور مسند احمد میں یہ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اتانی جبرئیل فامرنی" (جبرئیل آئے اور مجھے حکم دیا کہ میں اس آیت کو اس سورۃ کی فلاں جگہ پر رکھوں)(۱) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سورتوں میں نازل ہونے والی آیتوں کو جبرئیل علیہ السلام کے حکم سے آپ شریک کرتے تھے (دیکھو تفسیر منار العرفان ج ۱ ص ۲۰ و ن ۲) اس کا مطلب یہی ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس آیت کو جس سورۃ میں جس مقام پر رکھا ہے یہ کام بھی جبرئیل علیہ السلام ہی کے حکم سے ہوا ہے۔ مناظر احسن

(۱) علامہ ہیثمی مجمع الزوائد ج ۷ ص ۴۸ پر یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: رواہ احمد واسنادہ حسن (یعنی اسے امام احمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے) مرتب

ـــ "كتابه اثنان واربعون"(١)

ترجمہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبوں کی تعداد بیالیس (۴۲) تھی۔"

کاتبوں کی اتنی بڑی تعداد مقرر کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اگر وقت پر ایک نہ ملے تو دوسرا اس کو انجام دیدے۔ "عقد الفرید" میں ابن عبد ربہ نے حضرت حنظلہ بن ربیع (رضی اللہ عنہ) صحابی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"ان حنظلة بن ربيع كان خليفة كل كاتب من كتابه عليه السلام اذا غاب عن عمله." (عقد الفريد ج ۴ ص ۱۶۰، التراتيب الادارية ج ۱ ص ۱۱۸)

ترجمہ: "حنظلہ بن ربیع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام کاتبوں کے خلیفہ اور نائب تھے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو یہ حکم تھا کہ خواہ کوئی رہے یا نہ رہے وہ ضرور رہیں تاکہ کاتبوں میں سے اتفاقاً وقت پر اگر کوئی نہ ہو تو کتابت وحی کے کام میں کوئی رکاوٹ نہ واقع ہو۔ اسی انتظام کا یہ نتیجہ تھا کہ نزول کے ساتھ ہی ہر قرآنی آیت قید کتابت میں آ کر قلم بند ہو جاتی تھی۔ ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے طبرانی کے حوالہ سے مجمع الزوائد میں یہ روایت ہیثمی نے نقل کی ہے۔

"قالت كان جبرئيل عليه السلام يملي على النبي صلى الله عليه وسلم" (رواه الطبراني في الاوسط، ج ۸، ص ۲۵۸ ... مكتبة

(١) دیکھو الکتانی کی کتاب التراتیب الاداریہ ج ۱ ص ۱۱۶، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت۔ اس کتاب میں ان بیالیس (۴۲) کاتبوں کے نام بھی مل جائیں گے۔

المعارف ریاض ۱۹۹۵ء، تحقیق محمود طحان۔ مجمع الزوائد ج: ۷، ص: ۱۵۶)

ترجمہ: "ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھواتے تھے۔"

بظاہر اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اترنے کے ساتھ ہی جبرئیل علیہ السلام کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نازل شدہ آیتوں کو لکھوادیا کرتے تھے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کہ معلوم ہے کہ نہ لکھنا جانتے اور نہ قرآنی آیتوں کو خود لکھا کرتے تھے۔ البتہ اس احتیاط کی یہ کیفیت تھی کہ جب "غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ" کے الفاظ بطور اضافہ کے "لَا یَسْتَوِی الْقَاعِدُوْنَ" (النساء: ۹۵) والی مشہور آیت کے متعلق نازل ہوئے۔ مگر یہی اضافہ جو بقول امام مالکؒ حرف واحد کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس ای حرفی اضافہ کو بھی اسی وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قلم بند کرنے کا حکم دیا جس وقت وہ نازل ہوا۔ (دیکھو بخاری ج: ۲، ص: ۲۲۰ وغیرہ) امام مالکؒ نے "حرف واحد" اس کو ہارون سے ملاقات کے وقت کہا تھا۔ (دیکھئے درمنثور ج: ۳، ص: ۲۳۱، طبع دار الفکر بیروت ۱۹۹۳ء) احتیاط کا اقتضاء یہ بھی تھا کہ لکھوانے پر صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قناعت نہیں فرماتے تھے بلکہ کاتب جب لکھ لیتے تو آپ پڑھوا کر سنتے۔ کاتب وحی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ:

"فان کان فیه سقط اقامه۔" (مجمع الزوائد ج: ۱، ص: ۶۰)

ترجمہ: "اگر کوئی حرف یا لفظ لکھنے سے چھوٹ جاتا تو اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم درست کراتے۔"

جب یہ سب کام پورا ہو جاتا تب اشاعت عام کا حکم دیا جاتا تھا پھر جو لکھنا

جانتے تھے لکھ لیا کرتے تھے اور زبانی یاد کرنے والے زبانی یاد کر لیا کرتے تھے۔ یہی مطلب ہے زید کے ان الفاظ کا:

"لم اخرج به الی الناس."

ترجمہ: "(یعنی جب کتابت وتصحیح وغیرہ کے سارے مراتب ختم ہو جاتے) تب ہم لوگوں میں اس کو نکالتے یعنی شائع کرتے۔"

مگر ظاہر ہے کہ ایسی زیر تصنیف متعدد کتابیں جو قرآنی سورتوں کے طریقہ سے تدریجی طور پر مکمل ہو رہی ہوں تو ان کے متعلق یہ خیال کہ وہ مسلسل لکھی جاتیں صحیح نہ ہو گا بلکہ قرآنی سورتوں کی آیتوں کے نزول کا جو حال تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً ان آیتوں کی حیثیت اس قسم کی یادداشتوں کی تھی جنہیں مصنفین بالعموم پیش نظر تصانیف کے لیے پہلے جمع کرتے رہتے ہیں اور آہستہ آہستہ ان یادداشتوں کو ان کی متعلقہ کتابوں میں ترتیب کے ساتھ درج کرتے چلے جاتے ہیں۔

"ازالۃ الخفاء" میں شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

"مثل آن کہ امروز منشی منشآت خود را یا شاعر قصائد ومقطعات خود را در بیاضہا وسفینہا در دست جماعۃ متفرقہ گذاشتہ از عالم رود." (۱)

اور اسی سے ان دو روایتوں کا مطلب سمجھ میں آ جاتا ہے جو اس سلسلہ میں پائی جاتی ہیں یعنی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً قرآن اس قسم کی چیزوں سے مثلاً رقاع (چمڑا) لخاف (پتھر کی سفید پتلی پتلی تختیاں) کتف (اونٹ کے مونڈھے کی گول ہڈی) اور

(۱) ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۵

عسیب (کھجور کی شاخوں کی جڑ کا وہ کشادہ عریض حصہ جس میں کانٹے والے پتے نہیں ہوتے) پہ اور اسی قسم کی چیزوں میں لکھا جاتا تھا اور اسی کے ساتھ یہ روایت مستدرک حاکم میں پائی جاتی ہے یعنی بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین فرماتے تھے کہ:

"کنا عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نؤلف القرآن من الرقاع." (۱)

ترجمہ: "ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر رقاع (چھوٹی قطعات) میں قرآن کی تالیف کرتے تھے۔"

دونوں روایتوں سے قرآن کی کتابت کے دو طبعی مرحلوں کا پتہ چلتا ہے یعنی پہلی صورت کے متعلق تو یوں سمجھیے کہ شاعر اپنے مختلف اشعار کو جیسے وہ تیار ہوتے چلے جاتے ہوں چھوٹے چھوٹے پرزوں پر نوٹ کرتا چلا جاتا ہے۔ پھر جب اس کام سے فارغ ہو جاتا ہے تب ان ہی یادداشتوں سے اپنی غزلوں کو مرتب کرتا ہے۔ جس شعر کا جس غزل سے تعلق ہوتا ہے اسی میں اس کو داخل کر دیتا ہے۔ سمجھانا یہ ہے کہ یہی صورت قرآن کے متعلق اختیار کی گئی تھی وہی تھی البتہ اتنا فرق معلوم ہوتا ہے کہ عام لوگ کاغذ وغیرہ معمولی چیزوں پر اپنے منتشر اشعار یا خیالات کو ایسے بطور یادداشت کے لکھا کرتے ہیں۔ گویا شاہ ولی اللہؒ کے الفاظ میں یادداشت کے ان کاغذی پرزوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ:

"آں کاغذ پارہ آب برسد نابود ی آتش بگیرد با حامل آں بمیرد مانند امس ذاہب نابود گردد۔" (ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۵)

(۱) مستدرک حاکم ج ۲ ص ۲۰۳، نیز یہ حدیث جامع ترمذی (ج ۲، ص ۲۲۳) وغیرہ دیگر کتب حدیث میں بھی ہے۔

کا انتخاب فرمایا تھا جن کے متعلق یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ عام حوادث و آفات کا نسبتاً زیادہ مقابلہ کر سکتی ہیں۔ اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلافتِ صدیقی میں حکومت کی طرف سے زید بن ثابت صحابی رضی اللہ عنہ نے قرآن کا ایک نسخہ جو تیار کیا جس کا تفصیلی ذکر آگے آ رہا ہے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھائی ہوئی یہ ساری یادداشتیں بالکلیہ جوں کی توں اپنی اصلی حالت میں ان کو مل گئی تھیں۔ مکتوبہ یادداشتوں کے اس اعتبار سے یہ عجیب بات ہے کہ دس پانچ نہیں بلکہ وہ تین بھی نہیں صرف سورۂ برأت کی آخری حصہ کی ایک یادداشت جس میں صرف دو آیتیں تھیں۔ بس اور فقط یہی ایک یادداشت والا ٹکڑا اس پورے ذخیرے میں ان کو نہ مل سکا۔ لیکن ظاہر ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سینوں میں اور ان کے ذاتی مکتوبہ قرآنی نسخوں میں یہ آیتیں موجود تھیں بلکہ بطور وظیفہ کے ان کے پڑھنے سے

= خیمہ یک سرف اونٹ کے چمڑوں سے تیار کیا جاتا تھا۔ لخاف: ہر معمولی پتھر کو نہیں کہتے تھے بلکہ بالاتفاق اہلِ لغت نے لکھا ہے کہ سفید رنگ کی پتلی پتلی چوڑی چوڑی تختیاں پتھر سے بنائی جاتی تھیں۔ سلیٹ اور ان میں فرق گویا صرف رنگ کا ہوتا تھا اسی طرح اونٹ کے مونڈھے کے پاس کی گول ہڈی تختی کی طرح بن جاتی ہے۔ اس کو خاص طریقے سے تراش کر نکالا جاتا تھا۔ کاٹنے کے عمل میں بھی شگاف وغیرہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہو جاتا تھا (دیکھو مسند احمد کی روایت از زید بن ثابت صحابی رضی اللہ عنہ ص ۱۵۱) اسی لیے "قطعة من الكتف" بھی اسی کو کہتے تھے (مجمع البحار ادرج ۱، ص ۲۰) عسیب کھجور کی شاخ نہیں بلکہ پام قسم کے تمام درختوں کی شاخوں کا وہ حصہ جو تنے سے متصل ہوتا ہے اس میں کافی کشادگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمارے ناریل کی شاخوں میں ان کو آپ دیکھ سکتے ہیں عرب کی کھجور کی شاخوں کا یہ حصہ قریب قریب ہندوستان کے ناریل کی شاخوں کے اس حصہ کے برابر ہوتا تھا۔ اس حصہ کو شاخ سے جدا کر لیا جاتا تھا اور ان ہی ٹکڑوں کو خشک کر کے ان پر لکھتے تھے۔ اقتاب قتب کی جمع ہے، اونٹ کے کجاوہ میں چھوٹی تختیاں جو استعمال ہوتی ہیں ان کو کہتے ہیں۔ یہ چوڑے چوڑے پتلے پتلے تختوں کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ تر و تازہ لکڑی کے تختے تازگی کی وجہ سے عموماً کمزور ہوتے ہیں اور پرانے کجاووں (جاری ہے)

معلوم ہوتا ہے کہ عام رواج بھی تھا۔(۱)

بہرحال اس وقت تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسی ایک ٹکڑے کے سوا جس میں سورۂ برأت کی دو مشہور پوری آیتیں تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھائی ہوئی تمام ابتدائی یادداشتوں کا خلافت صدیقی کے زمانہ میں مل جانا خود بھی ایک ایسا واقعہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی چیزوں پر ان کے لکھنے کا انتظام کیا گیا تھا جو اتنی طویل مدت یعنی چوبیس پچیس سال تک حوادث و آفات سے محفوظ رہ سکیں اس لئے کہ نزول وحی کی ابتداء سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اس عہد تک جس میں قرآن کے متعلق

= میں استعمال زمانے سے ان کا عرب رواج بہت جاتا تھا۔ لکھنے کے کام کے آسانی جس نے سے وہ بن جاتے تھے۔ بتایا جائے کہ ان تفصیلات سے جو ناواقف ہوگا وہ ان عام پھیلے ہوئے الفاظ سے اگر غلط فہمی کا شکار ہو جائے تو کیا بعید ہے۔ مولانا گیلانی کی کتاب میں مبسوط بحث ان کتابی سواد پر کی گئی ہے۔ میں نے اسی کا خلاصہ یہاں درج کیا ہے۔ ۱۲

(۱) ابوداؤد (ج: ۵ ص: ۱۱۰) وغیرہ صحاح ستہ کی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اس باب میں جو مروی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ برأت کی آخری ان آیتوں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابیوں سے فرمایا کرتے تھے کہ صبح و شام جو آدمی ان کی تلاوت سات (۷) مرتبہ کرے گا اللہ تعالیٰ دنیا و دین کی مشکلات اس کی برکت سے حل کر دیں گے۔ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن آیتوں کی یہ خاصیت بیان کی ہو کون ہوگا جو معلوم ہو جانے کے بعد ان سے مستفید نہ ہوتا ہوگا۔ اس سلسلہ میں بعض عملی تجربات بھی لوگوں کو صحابہ ہی کے زمانے میں ہوئے تھے۔ محمد بن کعب نے اس فوجی مہم کا ذکر کرتے ہوئے جس نے روم کے علاقہ پر حملہ کیا تھا یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک فوجی سپاہی کی پنڈلی ٹوٹ گئی، راستہ میں بے چارے اٹک گئے راستے میں کسی نے ان کو سورۂ برأت کے انہی الفاظ کا وظیفہ بتایا اور کہا کہ اسی کو پڑھ کر ٹوٹے ہوئے مقام کو جھاڑ کر دیکھا جائے، کہتے ہیں کہ اس سے اس کی تصدیق ہوئی، یعنی پنڈلی ان کی درست ہو گئی اور اتنی درست ہو گئی کہ گھوڑے پر سوار ہو کر فوج میں پھر آ کر مل گئے۔

(دیکھو درمنثور ج ۳ ص ۲۳۲)

حکومت کے حکم سے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کام کیا، اتنی ہی مدت میں ہونا چاہیے۔

بہرحال ایام جاہلیت کی تاریخ سے جو واقف ہیں ان کا یہ خیال قطعاً بے بنیاد ہے کہ لکھنے کے سامان کی کمیابی کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی ابتدائی یادداشتوں کو اس قسم کی چیزوں یعنی ہڈی یا لخاف (پتلی باریک تختیوں)، عسیب (شاخ خرما کی جڑ کا عریض حصہ)، کتف (شانہ شتر) وغیرہ پر لکھوایا کرتے تھے۔ یقیناً یہ وہی کہہ سکتا ہے جسے جاہلی عرب کے صحیح حالات کا علم نہیں ہے۔ تفصیل تو آگے آرہی ہے، یہ کچھ نہیں تو ابھی مستدرک حاکم کی جو روایت گذری جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی آیات کی کتابت کے پہلے مرحلے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو بیٹھ کر رقاع میں صحابہ قرآن کو جمع کرتے تھے اور رقاع جیسا کہ معلوم ہے رقعہ کی جمع ہے، یہ چمڑے کے خاص قسم کے ٹکڑے ہوتے تھے جو لکھنے ہی کے لئے تیار کیے جاتے تھے گویا پارچمنٹ (PARCHMENT) جسے عربی میں رق کہتے ہیں اسی کی تعبیر رقاع کے لفظ سے کی گئی ہے یا پارچمنٹ ہی کی کسی خاص قسم کا نام رقاع تھا۔

آخر اس وقت رقاع (۱) سے کیا کام لیا جاتا تھا۔ ابتدائی کتابت کے وقت بھی

---

(۱) لغت کی کتاب "مجمع البحار" میں "رقاع" کی تحقیق کرتے ہوئے ایک دوسری حدیث بھی نقل کی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن لوگ آئیں گے "وعلی رقبته رقاع تخفق" پھر اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے "اراد بہ الرقاع ما علیہ من الحقوق المکتوبۃ فی الرقاع" جس کا مطلب یہی ہوا کہ دین اور قرض وغیرہ جیسے مطالبات ادا کیے بغیر مر جائیں گے قیامت کے دن ان مطالبات کے مطابق اپنی اپنی گردنوں میں باندھے ہوئے ہوں گے اور مطالبات کے یہ کاغذ رقاع میں لکھے ہوں گے، جس سے معلوم ہوا کہ "رقاع" کا یہ لفظ جو رقعہ کی جمع ہے ان کے متعلق ہے (جاری ہے)

بیان کی یہ تشریح پیدا ہوتی ہے کہ قرآن کی ہر آیت کو ایک تو اس وقت لکھ لیا جاتا تھا جس وقت وہ نازل ہوتی تھی پھر ہر ہر سورت مرتب ہونے کے بعد جس حد تک پہنچ جاتی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابیوں کو لکھوا دیتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر قرآن لکھنے کے جس کام کا ذکر مستدرک حاکم والی روایت میں کیا گیا ہے اس میں کتابت قرآن کی اسی دوسری منزل کا پتہ ان الفاظ میں جو دیا گیا ہے کہ وہ "ہم تالیف کرتے تھے" صحابہ کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف سورتوں میں جدید اضافے وحی کے ذریعہ جو ہوتے رہتے تھے ان اضافوں کو متعلقہ سورتوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے آپ کے سامنے بیٹھ کر جوڑتے تھے اور یوں تدریجاً قرآن کی ان سورتوں کے وہ نسخے جو صحابہ کے پاس جمع ہوتے چلے جاتے تھے مکمل ہوتے رہتے رہے۔(۱)

---

(۱) مستدرک حاکم کی مذکورہ بالا روایت یعنی صحابی کا بیان "کنا جلوسا عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نؤلف القرآن من الرقاع" (ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد بیٹھ کر قرآن کو رقاع میں تالیف کرتے تھے) خود اسی میں تالیف کرنے کا جو ذکر ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف نقل نہیں کرتے تھے بلکہ جن جن سورتوں کی متعلقہ آیتیں اس وقت تک نازل ہو چکی ہوتی تھیں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان کی سورتوں کے ان مقامات پر ترتیب دیکر لکھا کرتے تھے جہاں پر ان کو ہونا چاہیے تھا۔ بیہقی نے بھی تالیف کا مطلب یہی لیا ہے لکھا ہے کہ "المراد تالیف ما نزل من الآیات المتفرقۃ فی سورھا وجمعھا فیھا باشارۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم" (حاشیہ بخاری ج:۲، ص:۷۴۵، مطبوعہ ہند) جس کا حاصل وہی ہے جو میں نے عرض کیا۔ اسی کثرت سے صحابیوں نے براہ راست قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھا تھا کہ عہد عثمانی میں جب حکومت کی طرف سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ جس جس کے پاس پورا قرآن یا اس کی سورتیں ہوں تو ان کو لے کر حاضر ہوں تو بیان کیا جاتا ہے کہ لوگوں نے لاکر جمع کرنا شروع کیا "فکان الرجل یجیئ (جاری ہے)

وہی یہی نہیں کہ قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھ کر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین صرف زبانی یاد کر لیا کرتے تھے، بلکہ جو لکھنا جانتے تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر جیسے جیسے سورتیں مکمل ہوتی چلی جاتی تھیں ان کی نقل بھی لیتے چلے جاتے تھے اور آنحضرت کی منشاء کے مطابق ان کو مرتب کرتے جاتے تھے! اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے جس وقت تشریف لے گئے تو صحابہ کے سینوں میں بھی نیز ان کے سفینوں میں بھی قرآن محفوظ تھا۔ سینوں کی حفاظت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ عہد نبوت ہی میں بیر معونہ کا واقعہ پیش آیا تو جیسا کہ بخاری میں ہے کہ شہید ہونے والوں کی تعداد ستر (۷۰) کے قریب تھی۔ دھوکہ دے کر کفار نے ان کو قتل کر دیا تھا اور یہ سارے کے سارے قراء یعنی حافظ قرآن تھے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے کل ایک سال بعد عرب کی ایک مقامی یورش کو دبانے کے لئے عہد صدیقی میں یمامہ (نجد) فوجی دستہ بھیجا گیا تھا لیکن اتفاقاً کثیر تعداد شہید ہوئی۔ جس میں بھی یہی بیان کیا گیا ہے کہ قرآن کے حفاظ کی تعداد

= بالورقة والاديم فيه القرآن" (یعنی لوگ ورق اور چمڑے میں لکھے ہوئے قرآن کے ساتھ حاضر ہوئے) اسی میں یہ بھی ہے کہ "حتی جمع من ذلک کثرة" (یعنی بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا) بہر حال کھینچنے کی بات یہ ہے کہ جب یہ سارا ذخیرہ جمع ہو گیا تب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تشریف لائے۔ روایت ہے "فدعاهم رجلا رجلا فناشدهم اسمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو املّه عليك فيقول نعم (کنز العمال ج: ۱، ص: ۱۵۰) یعنی آپ ایک آدمی (یعنی صحابی) کو بلاتے اور قسم دے کر فرماتے کہ واقعی تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست سن کر لکھا ہے۔ صحابی کہتے کہ ہاں! اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں قرآنی سورتوں کی ایسی نقلیں کتنی کثرت سے صحابہ میں پھیل چکی تھیں جو براہ راست خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھی ہوئی تھیں۔ ۱۲ (مناظر احسن گیلانی)

سات سو (۷۰۰) تھی جیسا کہ بخاری کے حاشیہ میں ہے:۔

"کان عدۃ من قتل من القرآء سبعمائۃ." (ج:۲،ص:۵۷۴)

ترجمہ: "قرآن کے حفاظ اس جنگ میں جتنے شہید ہوئے تھے ان کی تعداد سات سو تھی۔" (۱)

ایک معمولی مقامی مہم میں شہید ہونے والوں کے اندر خیال تو کیجئے کہ جب سات سات سو (۷۰۰) صحابی ہوتے تھے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صحابہ میں کتنی زیادہ تعداد حفاظ کی پائی جاتی تھی اور یہی حال مکتوبہ نسخوں کی کثرت کا معلوم ہوتا ہے جو ان ہی صحابیوں کے پاس موجود تھے۔ مکہ کے ابتدائی زمانہ ہی میں کون نہیں جانتا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام میں اسی وجہ سے داخل ہوئے تھے کہ ان کی بہن قرآن پڑھ رہی تھیں۔ انہوں

---

(۱) اس تعداد پر تعجب نہ کرنا چاہیے عام تاریخوں مثلاً طبری وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہزار دو کئی سو آدمی مسلمانوں کی فوج کے یمامہ کی اسی مہم میں شہید ہوئے تھے، شہداء میں بڑے بڑے لوگ مثلاً سالم مولی ابی حذیفہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے حقیقی بھائی زید بن الخطاب رضی اللہ عنہ اس جنگ میں کام آئے۔ قرآن کے متعلق حضرت سالم مولی ابی حذیفہ کو خاص خصوصیت صحابہ میں حاصل تھی۔ بخاری (ج:۲، ص:۲۹۱) میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن چار صحابیوں سے قرآن پڑھنے کا حکم عام مسلمانوں کو دیا کرتے تھے، ان میں ایک سالم بھی تھے، طبری وغیرہ سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ سالم کے ساتھ جو فوجی دستہ تھا وہ اہل القرآن کا فوجی دستہ سمجھا جاتا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے سالم ہی سے قرآن پڑھا تھا اور استاذ کے ساتھ سب ہی شہید ہوئے تھے، حضرت سالم تنہا بھی تھے کہ نام قرآن والے لوگ ہی پیچھے ہٹ نہیں سکتے اور واقعہ یہ ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے، صحابی بیان کرتے ہیں کہ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں کو قرآن یاد کراتے تھے، خود صحابہ پر بھی قرآن کے سیکھنے پڑھنے اور یاد کرنے کا جذبہ چھایا ہوا تھا۔ مسلسل (جاری ہے)

نے اس کو چھیننا چاہا تو بہن نے انکار کر دیا۔ یہ واقعہ مشہور ہے اور سب جانتے ہیں۔(۱) کچھ نہیں تو ابتداءِ اسلام کا یہی ایک واقعہ اس عامیانہ خیال کی تردید کے لئے کافی ہے کہ ابتدائی

= تھا اور اس کے ساتھ اس کا بھی اگر خیال کیا جائے کہ امامت سے لے کر قبر میں دفن ہونے تک امتیاز اور ترجیح کا واحد معیار عہد نبوت میں صرف یہ تھا کہ قرآن جس کو زیادہ یاد ہو وہی امام بنایا جاتا تھا اور شہیدوں میں دفن کے وقت اسی کو پہلے دفن کیا جاتا تھا جو قرآن کے یاد کرنے میں زیادہ آگے ہوتا تھا۔ عرب کا دماغ جاہلی مشغلوں سے اس وقت خالی تھا، علمی پیاس اب میں جب پیدا ہوئی تو سب سے پہلے تشنگی بجھانے کے لئے ان کو قرآن ہی ملا۔ صحابہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن ان کے سینوں میں اس طرح جوش مارتا رہتا تھا جیسے کھولتی ہنڈیا جوش مارتی ہے جہاں کہیں ایک جگہ چند صحابی جمع ہو جاتے تھے تو لوگوں کا بیان ہے کہ دوی کدوی النحل (شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ) کی آواز گونجنے لگتی تھی، یعنی قرآن کا دور ہر ایک شروع کر دیتا تھا ان حالات میں اس پر کیوں تعجب کیجئے اگر یمامہ کی لڑائی میں سات سو قرآن کے حفاظ شہید ہو گئے۔ واقعہ کی اہمیت ہی کا تقاضا تو ہوا اور اس عظیم سانحہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو قرآنی سورتوں کی شیرازہ بندی پر اصرار کے ساتھ آمادہ کیا۔۱۲ (مناظر احسن گیلانی)

(۱) سیرت ابن ہشام میں ہے کہ بہن کی زدوکوب سے فارغ ہونے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طبیعت میں شرمندگی سی محسوس ہوئی اور بہن سے بولے "أعطيني الصحيفة التي سمعتكم تقرؤن آنفا" (ص ۲۱۷ ج ۱، بر روض الانف) یعنی جو صحیفہ (کتاب) تم لوگوں سے میں نے سنا پڑھتے ہوئے مجھے دو۔ اس پر ان کی بہن نے کہا "تم ناپاک ہو ایسی حالت میں اس کو چھو نہیں سکتے۔" "فاغتسل فاعطته الصحيفة" تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غسل کیا اور ان کی بہن نے صحیفہ ان کو دیا۔ صحیفہ دینے کے اس قصہ کا ذکر علاوہ سیرت کی کتابوں کے دار قطنی کی سنن میں بھی ہے۔ البتہ بجائے غسل کے اس میں وضو کرنے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ بہرحال "ثم اخذ الصحيفة" کے الفاظ اس روایت میں بھی ہیں۔ "روض الانف" میں لکھا ہے کہ اس صحیفہ میں صرف ایک سورہ طٰہٰ ہی نہیں تھی بلکہ طٰہٰ کے سوا کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ "اذا الشمس كورت" کی سورۃ بھی اس صحیفہ میں تھی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن سے مانگ کر پڑھا تھا۔ (دیکھو ج ۱، ص ۲۱۷، روض الانف سہیلی)

یادداشتوں کے سوا قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک کتابی شکل حاصل نہ کرسکا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمان عورتوں تک کے پاس قرآن کی نقلیں مکہ معظمہ ہی میں جب پائی جاتی تھیں تو زمانہ جیسے آگے کی طرف بڑھا کوئی وجہ ہو سکتی تھی کہ صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی نقل نہ حاصل کرتے ہوں، ذرا خیال تو کیجئے کہ بخاری (ج: ۱، ص: ۴۲۰) وغیرہ میں لوگ یہ بھی پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابیوں کو منع فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کو لے کر دشمن کے علاقے میں نہ جایا کرو، اگر مکتوبہ شکل میں قرآن کے نسخے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے پاس موجود ہی نہ تھے تو اس حکم کے معنی کیا ہوں گے اسی طرح روایتوں میں ہے کہ ناظرہ (۱) یعنی دیکھ کر قرآن کے پڑھنے کا ثواب رسول اللہ فرماتے تھے کہ زیادہ ہے۔ کیا اس حکم کی تعمیل مکتوبہ قرآن کے بغیر ممکن تھی۔ پس واقعہ یہی ہے جیسا کہ صحابہ خود ہی بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر وہ قرآن کی نقل حاصل کیا کرتے تھے اور یوں بکثرت قرآنی سورتوں کی نقلیں صحابہ

---

(۱) مثلاً حدیثوں میں ہے کہ ناظرہ دیکھ کر قرآن پڑھنے کا درجہ اسی قدر بلند ہے جتنا کہ فرض نماز کا نفل نماز پر فضیلت حاصل ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اللہ رسول کو جو دوست رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ قرآن المصحف میں پڑھے، اور یہ روایتیں تو صحاح کی عام کتابوں میں پائی جاتی ہیں مگر دارمی (۱) کی وہ مرفوع بھی روایت جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری خطبہ میں جب اس مقام پر پہنچے یعنی فرما رہے تھے کہ لوگوں قبل اس کے کہ یہ علم اٹھا لیا جائے اس کو حاصل کرو اس پر ایک اعرابی نے کہا کہ کیا علم اٹھا لیا جائے گا حالانکہ "المصاحف" یعنی مکتوبہ قرآن کے نسخے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ کیا اس سے زیادہ صریح شہادت اس بات کی مل سکتی ہے کہ عہد نبوت ہی میں گھر گھر قرآن کے نسخے پھیل چکے تھے۔ اس جستجو میں چاہا جائے تو اور بھی بہت سی روایتیں جمع ہو سکتی ہیں ۱۲ (مناظر احسن گیلانی)

(۱) ملاحظہ ہو فتح المنان شرح دارمی ج ۲، ص ۳۵۸، نیز یہ حدیث جامع ترمذی ج ۲، ص ۳۹۱ وغیرہ کتب حدیث میں بھی ہے۔ عبدالحلیم

رضوان اللہ علیہم اجمعین کے پاس موجود تھیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ قرآن کی یہ
سورتیں جن کی حیثیت مستقل رسالوں اور کتابوں کی تھی ان سب کو ایک ہی تقطیع اور سائز کے
اوراق پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں مجلد کرانے کا طریقہ رسول اللہ کے عہد میں مروج نہیں
ہوا تھا بلکہ ایک ہی مصنف کی مختلف کتابیں الگ الگ جلدوں کی شکل میں جیسے آج کل چھپی
ہوئی ملتی ہیں سمجھنا چاہیے کہ یہی حال گویا عموماً قرآن کی ان سورتوں کا تھا۔ اگرچہ بعض
روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انفرادی طور پر ایک سے زائد صحابیوں نے یہ کام بھی کر لیا تھا،
یعنی ایک ہی سائز پر لکھ کر ایک ہی جلد کی صورت میں قرآن کو جمع کر لیا تھا۔ لیکن اس کا عام
رواج نہیں ہوا تھا۔ (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عہد صدیقی میں قرآن کی جو

---

(۱) میرا اشارہ بخاری (ج ۲، ص: ۷۴۸) وغیرہ کی اس روایت کی طرف ہے جس میں بیان کیا گیا ہے
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں قرآن کو چار آدمیوں نے جمع کیا اور یہ سب انصار کے تھے، یعنی
ابی بن کعب، معاذ بن جبل، ابوزید اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم۔ عام طور پر جمع کرنے کا مطلب یہ لیا جاتا
ہے کہ زبانی یاد کیا تھا مگر یہ معلوم ہے کہ ستر (۷۰) صحابی جو شہید ہوئے تھے ان کی طرف "جمعوا القرآن
" (یعنی انہوں نے قرآن کو جمع کیا تھا) یہ الفاظ منسوب کیے گئے ہیں۔ ابن شہاب زہری بجائے
"جمعوا" کے "وعوہ" کا لفظ اس موقع پر استعمال کرتے تھے۔ یعنی زبانی یاد کیا تھا ان لوگوں نے قرآن کو
(کنز العمال، ج ۲، ص: ۳۵۰، بحاشیہ مسند احمد) پھر بخاری (ج ۲، ص: ۷۴۸) میں جن چار (۴)
انصاری صحابیوں کی طرف جمع قرآن کی خدمت کو جو منسوب کیا گیا ہے یقیناً اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے
کہ جمع قرآن کی اس خدمت کی نوعیت یاد کرنے سے یعنی سینوں میں جمع کرنے سے مختلف تھی، اور وہ یہی
ہو سکتی ہے کہ بجائے سینوں کے مان لیا جائے کہ ان چار انصاری بزرگوں نے پورے قرآن کو یعنی اس کی ہر
سورت کو ایک ہی سائز کے اوراق پر لکھنے کی امتیازی خدمت انجام دی تھی جس کی تعبیر جمع کرنے کے لفظ
سے کی گئی ہے، بلکہ چار صحابیوں کے جمع کرنے کا ذکر جس روایت میں کیا گیا ہے اسی روایت کے دوسرے
طریقوں کے جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ جمع قرآن کی یہ خدمت انہیں چار تک راوی (جاری ہے)

مشہور خدمت انجام دی گئی ہے اس کا تعلق اسی واقعہ سے ہے، میرا اشارہ بخاری (ج ۲، ص ۷۴۵) وغیرہ کی اسی مشہور روایت کی طرف ہے جس میں بیان کیا گیا

= نے جو خدمت انجام دی ہے اس کا تعلق انصار سے ہے یعنی تمام سورتوں کو ایک ہی تقطیع کے اوراق پر لکھ کر سب کو ایک جگہ جمع کرنے کا کام انصاری صحابیوں میں سے ان چار نے انجام دیا تھا۔ محمد بن کعب القرظی کے حوالے سے کنز العمال (ج ۲، ص ۳۷) ہی میں جو روایت ہے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں "جمع القرآن فی زمان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خمسة من الانصار" (یعنی انصار کے پانچ آدمیوں کا یہ حال تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں انہوں نے قرآن جمع کیا تھا) جس سے معلوم ہوا کہ انصار میں بھی جمع کرنے والوں کی تعداد چار سے زیادہ تھی۔ اور یہ بات تو واضح ہی ہوگئی کہ اس قصہ کا تعلق صرف انصار سے تھا۔ نیز طبرانی کے حوالہ سے کنز العمال (ج ۲، ص ۵۲) ہی میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ انصار میں سے "مجمع بن جاریہ" نے بھی قرآن جمع کیا تھا بجز دو یا تین سورتوں کے۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی مصنف کی جیسے کل کتابیں لوگ جمع کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں یعنی اکثر اس کے پاس کل تصنیفات نہیں ہوتیں، عہد نبوت میں عام صحابہ کا قرآنی سورتوں کے متعلق یہی حال تھا۔ کنز العمال میں ابن ابی داؤد کی کتاب "المصاحف" کے حوالے سے صحابہ کے متعلق یہ الفاظ صراحۃً بھی منقول ہیں "کانوا یکتبونه ذلک فی الصحف والالواح" (یعنی صحابہ نے قرآن کو صحیفوں اور تختیوں میں لکھ لیا تھا) (ج ۲، ص ۵۳، بر حاشیہ مسند احمد)

نہیں ہو گئی ہے یا یوں مسند احمد (ج ۱، ص ۲۵) ہی میں اس واقعہ کا تذکرہ جو ملتا ہے کہ قیس بن مروان نامی ایک صاحب کوفہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور آکر عرض کیا کہ ایک شخص کو کوفہ میں چھوڑ کر آیا ہوں جو قرآن کو زبانی لکھواتا ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر غصے سے بے خود ہوگئے اور غصے میں فرما رہے تھے ارے وہ کون شخص ہے جو ایسی جرأت کرتا ہے؟ قیس نے کہا کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ یہی کرتے ہیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا نام سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کچھ ٹھنڈے ہو گئے اور فرمایا کہ "خیر قرآن کے جاننے والوں میں میں نہیں جانتا کہ ان سے بھی بڑا عالم کوئی رہ گیا ہے۔" میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس روایت کے بعد یہ خیال کہ مطلق قرآن کو (جاری ہے)

ہے کہ یمامہ میں حفاظ قرآن کی شہادت پر غیر معمولی کثرت کو دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی درخواست پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی کاتب وحی زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ایک نسخہ قرآن کا وہ تیار کریں۔

نہ سمجھنے والوں نے خدا جانے اس روایت سے کیا کچھ سمجھ لیا ہے اور عجیب و غریب نتائج پیدا کر لیے۔ بعض اس روایت کو پیش کر کے مدعی ہو گئے کہ قرآن نے کتابی قالب عہد صدیقی ہی میں اختیار کیا ورنہ اس سے پہلے قرآن کی حیثیت زبانی یادداشتوں کی سی تھی۔ مگر جو کچھ اب تک عرض کیا جا چکا ہے اس سے واقف ہونے کے بعد کوئی صاحب فہم لمحہ بھر کے لیے کیا اس مغالطہ میں مبتلا رہ سکتا ہے؟ لوگ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ لکھوانے ہی کا اگر قصہ ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہنے کی کیا ضرورت تھی وہ تو خود لکھنا جانتے تھے۔ طرفہ ماجرا یہ ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس فرمان کے نافذ کرنے میں پس و پیش کا اظہار کیا مگر بعد کو وہ راضی ہو گئے۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں اس کام کو کیسے کروں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ بخاری (ج: ۲، ص: ۷۴۵) میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف یہ الفاظ منسوب کئے گئے ہیں:۔

"کیف تفعل شیئا لم یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔"

= زبانی لکھوانے کی ممانعت تھی اور یہ کہ جو بھی قرآن لکھتا تھا کسی لکھے ہوئے نسخے سے نقل کرتا تھا، اگر غور کیا جائے تو اس کے سوا کوئی دوسرا احتمال پیدا ہوتا ہے۔ ۱۲ (مناظر احسن گیلانی)

* مسند احمد کے علاوہ یہ قصہ "سیر اعلام النبلاء" (ج: ۱، ص: ۲۴۰) اور "حلیۃ الاولیاء" (ج: ۱، ص: ۳۴۲) میں بھی ہے۔ عبدالقیوم

ترجمہ: ''یعنی تو اس کام کو کیسے کر رہا ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔''

کیسی عجیب بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تو قاعدہ تھا کہ اترنے کے ساتھ ہی قرآن کی ہر آیت کو لکھوا دیتے تھے۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کام کو نہیں کیا اس کام کو کیسے کروں'' اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے اگر اس قصہ کا تعلق قرآن اور قرآنی سورتوں کے صرف لکھوانے اور قلمبند کرانے سے ہو؟ جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے۔

عہدِ صدیقی میں قرآنی خدمت کی صحیح نوعیت:

پس اصل واقعہ وہی ہے کہ قرآن کی تمام سورتوں کو ایک ہی تقطیع اور سائز پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں مجلد کروانے کا کام اور وہ بھی حکومت کی طرف سے اس کام کو انجام دلانا یہی ایسا کام تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہیں ہو پایا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسی خدمت کو حکومت کی طرف سے انجام دلانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ یہ چاہتے تھے کہ خلافت اور حکومت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے اور اپنی نگرانی میں اس کی تکمیل کرائے۔ بلاشبہ یہ ایک نیا اقدام تھا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس اقدام کے متعلق اگر تردد ہوا تو اس کی یقیناً گنجائش تھی، لیکن بعد کو خود ان کا فیصلہ بھی یہی ہوا کہ بجائے متفرق رسالوں کی صورت میں رہنے کے یہ زیادہ مناسب ہے کہ تمام قرآنی سورتوں کو ایک ہی تقطیع کے اوراق پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں سب کو مجلد کروا دیا جائے۔ پھر جیسا کہ سب جانتے ہیں بخاری کی اسی روایت میں ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حکومت کی طرف سے اس خدمت کے انجام دینے

کے لیے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انتخاب فرمایا اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اس کام کو پورا کیا۔(۱) کام کی رپورٹ کرتے ہوئے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے وہی باتیں کہیں جو آج بھی کتابوں کے نقل کرنے والے خصوصاً قرآن جیسی اہم کتابوں کے لکھنے اور چھاپنے والے عموماً کہا کرتے ہیں۔ یعنی مختلف نسخوں کو بھی انہوں نے لکھتے وقت پیش نظر رکھا۔ اسی سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھوائی ہوئی ابتدائی یادداشتیں جو رقاع، عسیب، لخاف وغیرہ پر تھیں ان کو بھی انہوں نے اپنے سامنے لکھتے وقت رکھ لیا تھا، نیز ہر آیت کی تصحیح دو دو حافظوں سے بھی کرتے چلے جاتے تھے، البتہ وہی سورۂ براءت کی آخری دو آیتیں ان کے متعلق رپورٹ میں انہوں نے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھائی ہوئی یادداشتوں میں وہ یادداشت ملی جس میں یہ آیتیں لکھی ہوئی تھیں اسی کے ساتھ یہ بھی بیان کیا کہ دو حافظوں کی تصحیح کی جو شرط تھی اس کی پابندی بھی ان آیتوں کے متعلق میں نے نہیں کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست ان کو میں سن چکا ہوں اور ایک صحابی جن کی شہادت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

(۱) امام شعبہ تو ہوئی سے اور شہاب زہری عبداللہ بن عمر کے صاحبزادے سالم کے حوالہ سے یہ روایت نقل کرتے تھے کہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے "القراطیس" پر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حکم سے قرآن کی کل سورتوں کو لکھا تھا، اور ایک ہی تقطیع کے اوراق جب بنائے جاتے تھے تو ان کو قراطیس کہتے تھے (دیکھو اتقان ص ۵۹، ج ۱) ایک سائز کے اوراق پر لکھے ہونے کی وجہ سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حکومت کے مرتب کردہ اس نسخہ کو "ربعہ" بھی کہتے تھے (دیکھو تدریب ج ۱ ص ۵۹) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ طول و عرض ان اوراق کا مساوی تھا "ربعۃ" جس کا ترجمہ "چوکھٹہ" کیا جا سکتا ہے۔ مصری معجم [illegible] ج ۱۳
(مناظر احسن گیلانی)

دو شہادتوں کے مساوی قرار دیا تھا(۱) یعنی خزیمہ بن ثابت (۲) انصاری رضی اللہ عنہ کی تنہا گواہی کو کافی سمجھا جس کی وجہ غالباً یہی کہ سورۂ براءت کی ان آیتوں کو بطور وظیفہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابیوں کو پڑھنے کا عام حکم دے رکھا تھا، اسی لئے عام طور پر دونوں آیتیں جانی پہچانی تھیں۔

---

(۱) واقعہ یہ ہوا تھا کہ ایک بدوی جس کا نام سواء بن قیس المحاربی تھا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک گھوڑے کی فروخت کا معاملہ کیا مگر بعد کو منکر گیا اور بولا کہ معاملہ کس کے سامنے ہوا؟ واقعہ یہ تھا کہ معاملہ کے وقت کوئی دوسرا موجود نہ تھا خزیمہ انصاری رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا کہ بیشک معاملہ ہوا تھا! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تم کب موجود تھے جو گواہی دے رہے ہو؟ خزیمہ نے کہا کہ آپ کی رسالت کو جب ہم حق کہتے ہیں تو بھلا گھوڑے کے معاملہ میں آپ کوئی خلاف واقعہ بات فرما سکتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی موقع پر فیصلہ فرمایا کہ خزیمہ جس کی موافقت یا مخالفت میں گواہی دیں ان کی گواہی کافی قرار دی جائے گی۔ (اسد الغابہ ج ۲ ص ۱۱۴)

(۲) اس صحابی کا نام خزیمہ تھا یا ابوخزیمہ۔ بخاری (ج ۱ ص ۷۴۶) تک کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ راویوں میں سے کسی راوی کو ان کا نام خزیمہ یاد رہا اور کسی کو ابوخزیمہ، اگرچہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ خزیمہ نام بتانے والے صحت سے زیادہ قریب ہیں۔ ان روایتوں میں ایک اختلاف یہ بھی پایا جاتا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق عہد صدیقی کی قرآنی خدمت سے تھا یا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حکومت نے جو کمیٹی بٹھائی تھی اس وقت یہ واقعہ پیش آیا تھا مگر ظاہر ہے کہ عہد عثمانی میں اس واقعہ کے پیش آنے کی صورت ہی کیا تھی۔ عہد صدیقی میں قرآن کے سارے اجزاء کی شیرازہ بندی ہو چکی تھی، عہد عثمانی میں تو صرف عہد صدیقی کے اسی مرتب نسخہ کی نقل کی گئی تھی جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن آیتوں کے متعلق زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے مذکورہ بالا بیان دیا تھا روایت کرنے والے خود ان آیتوں کی تعیین میں کچھ مبتلائے اشتباہ ہو گئے تھے بعض تو اسی سورۂ توبہ کا نام لیتے تھے اور بعض کہتے تھے کہ سورۂ احزاب کی "رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ" (الاحزاب: ۲۳) والی آیت تھی اور غالب قرینہ یہی ہے کہ براءت ہی والی آیت تھی کیونکہ عام طور پر بطور وظیفہ کے ان ہی دو (جاری ہے)

بہرحال حکومت کی جانب سے ایک ہی تقطیع کے اوراق پر تمام قرآنی سورتوں کے لکھوانے اور سب کو ایک ہی جلد میں مجلد کرانے کا مرحلہ تو عہد صدیقؓ ہی میں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ایک سال بعد ہی پورا ہو چکا تھا، علامہ قسطلانی شارح بخاری کے حوالے سے الکتانی نے نقل کیا ہے کہ:۔

"قد كان القرآن كله مكتوباً في عهده صلى الله عليه وسلم لكنه غير مجموع في موضع واحد" (ج: ۲، ص: ۳۸۴، التراتيب الادارية، الكتاني)

ترجمہ: "قرآن کل کا کل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں لکھا جا چکا

= آیتوں کے پڑھنے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا اس لئے ہر خاص و عام کے یاد ہونے کی وجہ سے زیادہ تفتیش و تلاش کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی، بلکہ روایتوں کے مختلف الفاظ پر اگر غور کیا جائے تو ان سے واقعہ کی اصل صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھوائی ہوئی یادداشتوں میں سے صرف یہی ایک ٹکڑا جس میں توبہ کی یہ دونوں آیتیں تھیں زید کو نہیں ملا تھا وہ خود فرماتے ہیں کہ وہ ٹکڑا مفقود تھا "فالتمسناها فوجدناها عند خزيمة" (پھر ہم لوگوں نے اس کو ڈھونڈھنا شروع کیا تو خزیمہ کے پاس اس گمشدہ رقعہ یا ٹکڑا کو پا لیا) بجائے مفرد صیغے کے "فالتمستها (میں نے ڈھونڈھا) فوجدتها" (پھر میں نے پایا) جمع کا صیغہ حضرت نے جو استعمال کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے صحابی تلاش میں بھی اور اس ٹکڑے کے پانے میں بھی شریک تھے۔ خزیمہ کے پاس یہ رقعہ یا ٹکڑا کیسے پہنچا تھا ممکن ہے کہ نقل کرنے یا کسی دوسری غرض سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خزیمہ مانگ کر لے گئے ہوں واپسی سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی یا کسی اور وجہ سے واپس کرنے کا موقع ان کو نہ مل سکا۔ ۲؎

تھا، البتہ ایک جگہ ساری سورتوں کو جمع نہیں کیا گیا تھا (یعنی ایک جلد سازی اور شیرازہ بندی ان سورتوں کی نہیں ہوئی تھی۔"

حارث محاسبی نے جو امام حنبلؒ کے معاصر ہیں اپنی کتاب "فہم السنن" میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں قرآن کی یادداشتوں کا جو مجموعہ تھا:

"وکان القرآن بمنزلۃ اوراق وجدت فی بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیھا منتشرا فجمعھا جامع وربطھا بخیط۔"

(اتقان، ج:۱، ص:۵۸)

ترجمہ: "اسی میں قرآنی سورتیں الگ الگ لکھی ہوئی تھیں (ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حکم سے جامع (یعنی زید بن ثابت رضی اللہ عنہ) نے ایک جگہ سب سورتوں کو جمع کیا اور ایک دھاگے سے سب کی شیرازہ بندی کی۔"

اور یہی کام یعنی ایک جلد میں مجلد کرانے کا کام عہد صدیقی میں انجام پایا لیکن دوسروں کو بھی اس کی تقلید پر یعنی ساری سورتوں کو ایک ہی تقطیع پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں مجلد کرائیں اور سورتوں کی جلد بندی میں جو ترتیب رکھی گئی تھی اس کی پابندی کریں اس پر لوگوں کو مجبور نہیں کیا گیا تھا، بلکہ ایک ہی مصنف کی چند کتابوں کو مختلف سائز کے اوراق پر جیسے لوگ چھاپتے ہیں اور کسی خاص ترتیب کی پابندی کے بغیر جس کے جی میں جس طرح آتا ہے ان کی جلد بندھواتا ہے۔ انفرادی آزادیوں کی کچھ یہی صورت حال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت تک قرآنی سورتوں کے متعلق رہی اس انفرادی آزادی میں حکومت نے دخل دینا مناسب خیال نہ کیا۔

عہدِ عثمانی میں قرآنی خدمت کی نوعیت

لیکن مختلف ممالک و امصار کے لوگ جب اسلام میں داخل ہوئے جن میں عرب ہی نہیں بلکہ بیرونِ عرب کی بھی ایسی بڑی آبادیاں شریک تھیں جن کی مادری زبان عربی نہ تھی۔

عربی لب ولہجہ کا اختلاف قبائل عرب اور عربی و غیر عربی مسلمانوں میں:

الفاظ و حروف کے صحیح تلفظ کی قدرت عموماً ان ہی میں پائی جاتی تھی، نیز خود عرب میں بھی قبائلی اختلاف لب ولہجہ میں بہ کثرت پایا جاتا تھا، اور اختلاف کی یہ نوعیت دنیا کی تمام زبانوں میں عام ہے۔ ابن قتیبہؒ نے لب ولہجہ کے قبائلی اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ:

"فالهذلي يقرء عتى حين والاسدى يقرء تعلمون بكسر والتميمى يهمل والقريشي لايهمل." (۱)

ترجمہ۔ "ہذلی یعنی بنی ہذیل کے قبیلہ والے (حتیٰ حین) کو عتیٰ عین پڑھتے ہیں، اسی طرح تعلمون کی (ت) کو زیر کے ساتھ اسدی یعنی بنی اسد والے تلفظ کرتے ہیں اسی طرح تمیمی اہمال سے کام لیتا ہے قریشی یہ نہیں کرتا۔"

اسی طرح تابوت کا تلفظ خود مدینہ والے "تابوہ" کرتے تھے، اور بعض ایسی

---

(۱) تبیان فی مباحث القرآن ص: ۳۳ ۔ صالح الجزائری

بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ قرآن کے پڑھنے میں عربی قبائل اور عجمی نومسلموں کی طرف سے ان اختلاف کا جب ظہور ہوا اور ہر ایک اپنے تلفظ کی صحت پر اصرار بے جا کرنے لگا تو اس وقت حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس نسخہ کی نقل کرانے کے لیے جو عہد صدیقی میں تیار ہوا تھا حکومت کی طرف سے ایک سررشتہ قائم کر دیا۔ اس سررشتہ کے افسر بھی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہی مقرر کیے گئے جنہوں نے عہد صدیقی میں نسخہ تیار کیا تھا۔ (۱) اور مزید تیار ہو (۱۱) ارکان کا ان کی امداد کے لیے اضافہ کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ کتابت کی حد تک قرآن کو اسی لہجہ اور تلفظ میں لکھا جائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تلفظ اور لہجہ تھا۔ اسی سررشتہ نے صدیقی نسخہ کی چند نقلیں تیار کیں پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک ایک نسخہ سررشتہ کا تیار کیا ہوا مختلف صوبوں کے پایہ تخت اور چھاؤنیوں میں بھیج کر فرمان جاری کر دیا کہ اپنے اپنے قبائل یا انفرادی لہجوں یا تلفظ کے لحاظ سے لکھے ہوئے قرآنی نسخے لوگوں کے پاس جو موجود ہوں وہ حکومت کے حوالے کر دیے جائیں تا کہ ان نسخوں کو معدوم کر دیا جائے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں قرآن شریف کی خدمت یہی اور صرف یہی ہوئی ہے جو بجائے خود بہت بڑی اور اہم خدمت ہے ورنہ مختلف عربی قبائل اور عجمیوں کے طریقہ ادا لب ولہجہ کے اختلاف کی بنیاد پر لکھے ہوئے قرآنی نسخے خدانخواستہ اگر دنیا

(۱) زید بن ثابت نو عمری میں ہی مسلمان ہوئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خصوصیت کے ساتھ کتابت کا کام ان سے لیا کرتے تھے حتی کہ اسی سلسلہ میں یہودیوں کے اور زبان کی تعلیم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے انہوں نے حاصل کی تھی۔ یہ ان صحابیوں میں سے ہیں جنہوں نے تصنیفی یادگار چھوڑی فرائض و مواریث کے متعلق ان کی ایک کتاب کا ذکر مورخین کرتے ہیں ۱۲ (مناظر احسن گیلانی)

میں پھیل جاتے تو قدرتی بات تھی کہ دشمنانِ اسلام اس بات کو بتنگڑ بنا کر کہاں سے کہاں پہنچا دیتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مسلمانوں پر بہت بڑا احسان ہے کہ لکھاوٹ یعنی نوشت و کتابت کی حد تک انہوں نے قرآن میں وحدت کا رنگ پیدا کر دیا، رہا تلفظ تو ظاہر ہے کہ اس میں وحدت اور یکسانی کا مطالبہ ان کے بس کی بات تھی بھی نہیں اسی لیے اس مطالبے کو نظر انداز کر دیا گیا اور آزادی بخشی گئی کہ جس کا جو تلفظ ہے یا تلفظ کی جس نوعیت پر جو قادر ہے اسی تلفظ اور لب ولہجہ میں قرآن شریف کو وہ پڑھ سکتا ہے۔ ایک حدیث بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجود تھی، جس میں فیصلہ فرما دیا گیا تھا کہ قرآن مجید ایک ہی "حرف" یعنی تلفظ پر نازل نہیں ہوا ہے بلکہ "سبعة أحرف"(۱) یعنی متعدد تلفظ کی اس میں گنجائش ہے اگرچہ کوشش تو اسی کی کرنی چاہیے کہ اسی لب ولہجہ میں قرآن کی تلاوت ہر مسلمان کو میسر ہو جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا لب ولہجہ تھا۔ اسی لیے تجوید اور قرأت کا ایک مستقل فن ابتدا ہی سے مسلمانوں میں مروج ہو گیا اور عبرت کے لیے (یعنی یہ بتانے کے لیے کہ کوشش کی جائے تو غیر عربی آدمی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریشی لب ولہجہ میں قرآن پڑھ سکتا ہے) قرأت و تجوید کے لئے اسی قسم کے لوگوں کا عہد صحابہ و تابعین ہی میں عموماً انتخاب کیا گیا جو نسلاً عرب نہ تھے، فن قرأت کے ائمہ بعد کو عجمی نژاد قاریوں

---

(۱) جس حدیث میں "سبعة أحرف" کا ذکر آیا ہے جس کا لفظی ترجمہ تو یہی ہے کہ سات حرفوں پر قرآن نازل ہوا ہے۔ اس کی شرح میں حدیث کے شرح کرنے والوں نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن ارباب تحقیق کا فیصلہ یہی ہے کہ "سبعة" یعنی سات کے عدد سے واقعی سات کا عدد مراد نہیں ہے بلکہ اردو میں جیسے "سیکڑوں" کے لفظ سے صرف کثرت مقصود ہوتا ہے یہی حال عربی زبان میں سات کا ہے اور "أحرف" یعنی حرفوں سے یہی تلفظ اور لب ولہجہ کا اختلاف مقصود ہے۔ دیکھو فیض شرح مشکوۃ (ج:۳ ص: ۲۸۸) وغیرہ۔

کی جماعت ہوئی۔(۱)

بہرحال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ کا کارنامہ قرآن کے متعلق جو کچھ بھی ہے وہ یہی ہے کہ کتابت اور لکھاوٹ کی حد تک تلفظ اور لب ولہجہ کے جھگڑوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا گیا اور یہ کام بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے تقریباً کل چودہ پندرہ سال بعد انجام پایا۔ آج ممکن ہے کہ خلافت عثمانی کے عہد کی اس قرآنی خدمت کی قیمت واہمیت کا لوگوں کو صحیح اندازہ نہ ہو سکے، لیکن ذرا سوچئے تو سہی کہ ابتداء ہی میں مسلمانوں کو کتابت کی اسی ایک شکل پر جمع نہیں کر دیا جاتا تو نتیجہ کیا ہوتا؟

عجمی مسلمانوں کو تو ابھی جانے دیجئے خود عربی قبائل میں تلفظ اور لہجوں کے اختلافات کیا معمولی تھے؟ قرآنی آیت "قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا" (مریم: ۲۴) کو قبیلہ قیس والے جو "ک" تانیث کا تلفظ "ش" سے کرتے تھے ظاہر ہے کہ اس بنیاد پر یہی آیت قیس کے قبیلہ والوں کے قرآن میں اگر اس شکل میں لکھی ہوئی ملتی یعنی "قَدْ جَعَلَ رَبُّشِ تَحْتَشِ سَرِيًّا" قیس کے اس طرز تلفظ کا اصطلاحی نام کشکشۃ قیس تھا۔ اسی طرح تمیم والے "اَن" کے لفظ کو "عن" کی شکل میں ادا کرتے تھے اس کا نام عنعنۃ تمیم تھا۔ مثلاً "فَعَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ" (مائدہ: ۵۲) کو "فَعَسَى اللَّهُ عَنْ يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ" کی شکل میں وہ

---

(۱) اور واقعی اس پر تعجب ہوتا ہے کہ قراء قرآن کے طبقہ اولیٰ ہی میں ہم قالون اور ورش وغیرہ نام رکھنے والے بزرگوں کو پاتے ہیں۔ ورش تو خیر کہتے ہیں کہ ورشان (فاختہ) کے عربی لفظ کا اختصار ہے لیکن قالون کے متعلق تو اس کی تصریح کی گئی ہے کہ یہ یونانی یعنی رومی لفظ ہے لکھا ہے کہ عربی میں پہنچ کر صرف اتنا تصرف ہوا کہ کالون کو قالون یعنی کاف کو قاف سے بدل دیا گیا کہتے ہیں کہ کالون کے معنی جید کے ہیں باقی یوں بھی آپ کو قراء سبعہ جو اس فن کے ائمہ ہیں ان میں زیادہ تر عجمی النسل اور موالی طبقہ سے تعلق رکھنے والے حضرات ملیں گے۔ ۱۲ (مناظر احسن گیلانی)

ادا کرتے تھے اور سب سے دلچسپ اس قبیلہ کا تلفظ تھا جو "س" کے حرف کو "ت" کی شکل میں ادا کیا کرتا تھا اسی وجہ سے پوری سورۂ "والناس" کی ہر آیت کے آخری لفظ میں بجائے "س" کے ان کے قرآن میں ہم کو "ت" کو پڑھتے مثلاً "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاتِ" اس معاملے میں لوگ اس درجہ مجبور تھے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی اصلاً ونسلاً ہذیل قبیلہ سے تھے ان تک کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس لیے ٹوکا کہ وہ "حَتّٰی حِیْنٍ" کا تلفظ "عَتّٰی عِیْنٍ" کی شکل میں کر رہے تھے۔(۱)

جب خالص عربی قبائل کا یہ حال تھا تو بے چارے عجمیوں میں پہنچ کر قرآنی نسخوں کی جو حالت ہوتی وہ ظاہر ہے۔ دور کیوں جائیے ہندوستان ہی کا تجربہ کیا ہوا ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ اس صورت میں جتنے قرآن پنجاب میں طبع ہوتے ان میں ہر جگہ بجائے "ق" کی جگہ "ک" ہی چھاپا جاتا، اسی طرح دکن میں جو قرآن چھپتے اس میں "ق" کی جگہ "خ" اور "خ" کی جگہ "ق" لوگوں کو ہر جگہ نظر آتا۔ اور اس قسم کے اختلافات کو کون روک سکتا ہے جو تھوڑے فاصلے سے تلفظ اور لہجے کے یہ اختلافات زبانوں میں پیدا ہو ہی جاتے ہیں۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مدرسہ کے معلمین جو مختلف لہجوں میں قرآن پڑھاتے ہیں انہی میں "یکفر بعضھم بعضاً"(۲) کی نوبت تک آگئی تھی تو سمجھا جا سکتا ہے کہ آگے بڑھ کر یہی اختلافات مسلمانوں کو خطرے کے کس نقطہ تک پہنچا دیتے؟

(۱) قبائل عرب کے لب و لہجہ کے اختلاف کے سلسلے میں جو مثالیں دی گئی ہیں علاوہ دوسری کتابوں کے دلچسپ نمونہ "الاتقان" میں بھی اس کا کافی مواد مل سکتا ہے۔ دیکھئے صفحات: ۱۳۰ ج ۱ وغیرہ۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ والی روایت کا ذکر بھی اسی کتاب میں کیا گیا ہے۔

(۲) یعنی بعض بعض کو کافر ٹھہرانے لگے۔ اس کی تفصیل بھی اور کتابوں کے علاوہ اتقان ہی میں مل سکتی ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کیا جامع القرآن تھے؟

واقعہ یہ ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حکومت کی اس عظیم و جلیل خدمت کے مسلمان بہت ممنون نظر آتے ہیں اور عموماً اس کا تذکرہ کرتے ہیں، حتیٰ کہ خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بہت اچھا کیا اور جو کچھ کیا ہم سب کے مشورے سے کیا، انہوں نے پوچھا کہ مسلمانوں میں یہ جھگڑا جو چھڑ گیا ہے کہ ہر ایک اپنی قرأت کو دوسروں کی قرأت سے بہتر قرار دیتا ہے بلکہ دوسرے کی قرأت کو کفر کی حد تک پہنچا دیا جاتا ہے اس کا علاج کیا کیا جائے؟ ہم لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے کیا علاج سوچا ہے؟ تو عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا۔

"نری أن نجمع الناس علی مصحف واحد" (۱)

ترجمہ: "ہمارا خیال ہے کہ لوگوں کو ایک ہی مصحف پر جمع کرا دیا جائے۔"

یہی "جمع الناس علی مصحف واحد" عہد عثمانی کی قرآنی خدمت کی صحیح تعبیر ہے یعنی مسلمانوں کو ایک ہی مصحف پر آپ نے جمع فرمایا۔ عوام نے ان کے اسی خطاب کو جامع القرآن (۲) کے نام سے مشہور کر دیا جو نہ صرف یہی کہ واقعہ کی صحیح تعبیر نہیں

---

(۱) دیکھو مختصر کنز العمال برحاشیہ مسند احمد ج ۲ ص ۳۰۔

(۲) یہ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں میں یہ غلط فہمی زمانے سے چلی آتی ہے، تیسری صدی کے مشہور صوفی اور عالم حارث محاسبی کا یہ قول اتقان میں سیوطی نے نقل کیا ہے "المشہور عند الناس أن جامع القرآن عثمان ولیس کذلک، انما حمل عثمان الناس علی القراءة بوجه واحد" (لوگوں میں مشہور ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جامع القرآن ہیں حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے انہوں نے لوگوں کو قرآن کی ایک ہی قرأت پر صرف جمع کیا) (الاتقان ج ۱ ص ۶۰)۔ اتقان کی (جو ...

ہے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ عام طور پر اس تعبیر سے بڑی غلط فہمی پھیل گئی ، لوگ سمجھنے لگے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پہلے گویا قرآن جمع کیا ہوا یا لکھا ہوا نہ تھا اور یہ تو ایک تعبیری غلطی ہے بجائے جامع القرآن کے جامع الناس علی القرآن سے جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا اس کی اصلاح ہو سکتی ہے مگر بنی قصہ یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف قرآن کی اس خدمت کا انتساب اور اس کی شہرت ایک بڑے فتنہ کا مقدمہ بن گئی۔ اور اب ہم اسی فتنہ کے متعلق جیسا کہ مولانا گیلانی نے لکھا ہے کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

ایک بڑے فتنہ کا سد باب :

بنی امیہ نے اسلامی حکومت پر قبضہ کر کے جب خلافت کو سلطنت کی شکل میں بدل دیا اور روم و ایران کے حکمرانوں کو نمونہ بنا کر حکومت کرنے لگے تو مسلمانوں میں قدرتاً جیسا کہ چاہیے تھا بے چینی پیدا ہوئی اور اس نے ایک عام کشمکش کی شکل حکومت اور عوام کے درمیان پیدا کر دی اس کشمکش کے دبانے کے سلسلہ میں جو بے پناہ مظالم بنی امیہ کے حکمرانوں کی طرف سے مسلمانوں پر توڑے گئے ان کے لئے صرف ایک حجاج ہی کا نام کافی ہو سکتا ہے جس نے ایک لاکھ (۱۰۰،۰۰۰) مسلمانوں کو صبراً (سامنے باندھ کر) قتل کروایا۔

= میں ابن الحسین کا قول نقل کیا ہے کہ صرف قریش کے لغت اور لب و لہجہ پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن لکھوایا لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ "ان کان قد وسع فی قرائته بلغة غیرهم رفعا للحرج والمشقة" (ج ۱ ص ۶۰) یعنی عرب کی دوسری قوموں کو اپنے لب و لہجہ پر تلاوت کی بات پڑھتے ہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اجازت دے رکھی تھی کہ دوسرے لہجہ تلفظ میں بھی پڑھ سکتے ہیں اس سے ان کا مقصد مشقت کا ازالہ مقصود تھا۔

اسی کشمکش کے سلسلہ میں لعنت وملامت کا قصہ جب دراز ہوا تو بنی امیہ سے آگے بڑھ کر بعض خفیف العقل گرم مزاج لوگوں کی زبانیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر بھی کھلنے لگیں کیونکہ بنی امیہ والے آپ کے نام اور خاندانی تعلق سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے اور مسلمانوں پر احسان جتاتے تھے کہ ہمارے خاندان ہی نے تمہارے قرآن کو محفوظ کر دیا ورنہ تمہارے مذہب کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی اور اشارہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت کی اسی قرآنی خدمت کی طرف کیا جاتا۔ عبد الملک بن مروان برسر منبر مسلمانوں سے کہتا:۔

" فالزموا ما في مصحفكم الذي جمعكم عليه الامام المظلوم. (رحمه الله)" (۱)

ترجمہ: ''مسلمانو! اپنے مظلوم امام وخلیفہ (یعنی عثمان رضی اللہ عنہ) کے مصحف کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو۔''

ظاہر ہے کہ قرآن جو نہ بے چارے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر نازل ہوا تھا نہ انہوں نے ہی کو ابتداء لکھوایا تھا حتیٰ کہ ایک جلد میں تمام سورتوں کو مجلد کرانے کا کام بھی ان کی حکومت کی طرف سے نہیں انجام پایا تھا۔ البتہ آخر میں بجائے مختلف لہجوں کے کتابت کی حد تک مسلمانوں کو ایک ہی نسخہ پر جمع کرنے کا انتظام اپنی حکومت کی طرف سے کر دیا تھا محض اس لیے اس قرآن کو جس کو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، امام مظلوم کا مصحف اور قرآن قرار دینا مسلمانوں کو برہم کر دینے کے لئے کافی تھا، رد عمل آخر اس کا اس شکل میں ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی قرآنی خدمت کی اہمیت ہی کو لوگ اٹھانے لگے اور فریق مخالف میں جو زیادہ تند خو گرم مزاج تھے وہ حضرت عثمان رضی

(۱) طبقات ابن سعد (ج ۵ ص ۲۳۳) ذکر عبد الملک۔ ۱۲

اللہ عنہ پر الٹے سیدھے طرح طرح کے الزامات بھی تھوپنے لگے اور جو قرآن خالقِ عالم کی طرف سے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سارے جہان کے انسانوں کے لیے اترا تھا اس کا نام ہی ان لوگوں نے "بیاضِ عثمانی" العیاذ باللہ رکھ دیا جو "مصحفِ امام مظلوم" کے کلوخ کی پاداش بہ شکل "سنگ" تھی۔ سچ پوچھیے تو بنی امیہ کے اسی طرزِ عمل کی مخالفت میں بعض ناعاقبت اندیش لوگوں نے مسلمانوں میں جعلی بے سروپا روایتیں خود ہی گھڑ گھڑ کر پھیلا دیں اور ان میں جو زیادہ چالاک تھے، جانتے تھے کہ جعلی روایتوں کا پردہ بآسانی چاک ہو جائے گا۔ انہوں نے بعض صحیح و ثابت روایتوں کو غلط مقصد کے لئے استعمال کیا ان لوگوں کی یہ دوسری تدبیر زیادہ کارگر ثابت ہوئی اچھے اچھے لوگ ان مغالطوں کا شکار ہو گئے۔ اس سلسلہ میں مولانا گیلانی نے جو کچھ ارقام فرمایا ہے اس کا خلاصہ درج کرتا ہوں۔

سہولت کے لیے روایات کے اس ذخیرہ کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا جاتا ہے، ایک حصہ تو ان خود تراشیدہ فرضی روایات کا ہے مولانا نے جن کی تعبیر مضحکات کے لفظ سے کی ہے، کیونکہ ان کو سن کر کوئی شخص اپنی ہنسی مشکل ہی سے ضبط کر سکتا ہے اور جن صحیح روایات سے ناجائز نفع اٹھاتے ہوئے مغالطہ دینے کی کوشش کی گئی ان کے لئے "مغالطات" کا عنوان قائم کیا جائے گا۔

مضحکات:

- کہا جاتا ہے کہ قرآنی آیت "وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ" (الصافات: ۲۴) کے آخر میں "عن ولایة علی" کے الفاظ تھے جنہیں عہدِ عثمانی میں قصداً قرآن

سے خارج کر دیا گیا یعنی قرآن میں یہ لکھا ہوا تھا کہ میدانِ حشر میں لوگوں کو حضرت علی کی ولایت کے متعلق پوچھا جائے گا۔

۲۔ اسی طرح کوئی صاحب "محمد بن جہم الہلالی" تھے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف منسوب کر کے انہوں نے یہ مشہور کیا کہ قرآنی آیت "أمة هي أربى من أمة" (النحل: ۹۲) میں تحریف کی گئی ہے اصلی الفاظ "أئمتنا هي أزكى من أئمتكم" تھے۔ (۱)

۳۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ قرآن میں قبیلۂ قریش کے ستر (۷۰) نام بقید نسب موجود تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سب کو ساقط فرما دیا۔

۴۔ اسی طرح "كفى الله المؤمنين القتال" (الأحزاب: ۲۵) کی آیت میں کہتے ہیں کہ "علی بن ابی طالب" کے الفاظ بھی تھے۔ (۲) اسی قسم کی بیسیوں (۳) خرافات اس طبقہ کی طرف سے پھیلائی گئیں۔ اگر مسلمانوں کے پاس روایتوں کے جانچنے کا خاص طریقہ راویوں کی تحقیق کے متعلق نہ ہوتا تو ان جھوٹی قطعاً جعلی روایتوں کے محض بے بنیاد اور محض گپ ہونے کا فیصلہ آسان نہ ہوتا۔ ان لوگوں نے صرف کمی کی الفاظ ہی نہیں بلکہ کہتے ہیں کہ سورۂ ولایت کے نام سے ایک مستقل سورۃ بھی قرآن میں تھی جس میں اہل بیت کے ائمہ اور ان کے حقوق وغیرہ کا تفصیلی ذکر تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس پوری سورت ہی کو حذف کر دیا۔ یہی بولی اس شیعی عالم نے جس کا پہلے بھی میں نے ذکر کیا ہے یعنی

---

(۱) ہمارے ائمہ بنی امیہ کے حکمرانوں سے بہتر ہیں۔۱۲

(۲) جس کا مطلب یہ ہوا کہ جنگ کے لیے حضرت علی مسلمانوں کی طرف سے کافی ہو گئے۔۱۲

(۳) یہ سارے مضحکات آپ کو تفسیر "روح المعانی" کے مقدمہ ص ۲۱۔۲۴ میں مل سکتے ہیں۔۱۲

سنت کے محدثین میں بھی ثقہ کی بعض روایتیں پائی جاتی ہیں، یعنی ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی بعض آیتیں جو پہلے قرآن میں شریک تھیں بعد کو حذف ہو گئیں جنہیں ابھی آپ کو معلوم ہو گا کہ بجائے خود یہ روایتیں غلط نہیں ہیں بلکہ ان سے جو نتیجہ پیدا کیا گیا وہ بھی یا کم از کم غلط فہمی پر ضرور مبنی ہے۔ بقدر ضرورت ان میں جو چیزیں قابل ذکر ہیں ان کا قصہ بھی سن لیجیے۔

اس سلسلہ میں مختلف نوعیت کی روایتیں ہیں۔ مثلاً

(۱) بعض روایتوں میں کسی غیر قرآنی حکم کا ذکر کرتے ہوئے اس قسم کے الفاظ یعنی،

"فی ما انزل من القرآن۔"

ترجمہ: "یہ اسی سلسلہ اور مادہ کی چیز ہے جس راہ سے قرآن نازل ہوا"

حدیث رضاعت:

جیسے اتفاقاً راوی نے جو حوالے دیئے ہیں اس کی مثال رضاعت والی روایت جو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے الفاظ حدیث کے یہ ہیں، یعنی وہ فرماتی تھیں کہ:

"فيما أنزل من القرآن عشر رضعات معلومات يحرمن ثم نسخن بخمس معلومات فتوفي صلى الله عليه وسلم وهن فيما يقرأ من القرآن" (۱)

(۱) صحیح مسلم (ج:۱، ص:۴۷۱)، ابوداؤد (ج:۲، ص:۲۸۰)، ترمذی (ج:۲، ص:۳۳۳)، نسائی (ص:۹۳، طبع دوم ۱۴۰۰ھ)، ابن ماجہ (ج:۲، ص:۲۷۲)

> ترجمہ: ”ان ہی باتوں میں جو اسی راہ سے نازل ہوئی ہیں جس راہ سے قرآن نازل ہوا یہ حکم بھی تھا کہ دس چوسنت یا دس دفعہ چوسنا حرام کر دیا ہے پھر منسوخ ہو گیا یہ حکم ”پانچ مقررہ گھونٹ سے“ اور وفات پا گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور یہ حکم ان ہی باتوں میں شریک تھا جن میں قرآنی حکم شریک ہیں۔“

واقعہ یہ ہے کہ بجز بخاری کے صحاح ستہ کی تمام کتابوں میں یہ روایت پائی جاتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ”فیما انزل من القرآن“ یا ”فیما یقرء من القرآن“ کے الفاظ سے یہ کیسے سمجھ لیا گیا کہ یہ قرآن کے اجزاء تھے۔ تفصیل کے لیے تو مولانا گیلانی کی اصل کتاب کا مطالعہ مناسب ہوگا، یہاں اسی کتاب سے اخذ کر کے بقدر ضرورت بحث کی جاتی ہے۔

”خلاصہ بات سے تو ہر پڑھا لکھا مسلمان واقف ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو احکام و قوانین امت کو عطا کیے جاتے تھے ان میں ایک سلسلہ تو ان احکام کا تھا جن کی تعلیم حق تعالیٰ کی طرف سے جبرئیل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے اور دوسرا سلسلہ احکام کا ایسا بھی تھا جن میں پیغمبر خود اپنے اجتہاد سے کام لیتے تھے، اگرچہ ”إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ“ (النجم ۴) کے لحاظ سے ہم دونوں کو وحی ہی کہتے ہیں۔ بہر حال ظاہر ہے کہ وحی کا وہ سلسلہ جو جبرئیل امین کی راہ سے جاری تھا وہ اپنی الگ نوعیت رکھتا تھا۔ پھر جبرئیل امین کی راہ سے جو چیزیں آتی تھیں ہر ایک جانتا ہے کہ ان کی بھی دو قسمیں تھیں، یعنی ایک قرآن اور قرآنی آیات کا سلسلہ اور دوسرا سلسلہ جبرئیل امین ہی کے ذریعہ سے وہ بھی جاری تھا جو قرآن کا جز نہیں بنتا تھا گویا منطقی طور پر یوں کہہ لیجیے کہ قرآن تو وہ ہے جو جبرئیل کے ذریعہ نازل ہوا لیکن ہر وہ چیز جو جبرئیل کے ذریعہ سے نازل

ہوئی تھی اس کا قرآن ہونا ضروری نہ تھا آخر ایمان واسلام واحسان کے متعلق سوال وجواب کا جو قصہ بخاری (ج:۱ ،ص:۱۲) میں ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کے متعلق فرمایا کہ:۔

"جاء جبرئیل علیہ السلام یعلمکم دینکم."

ترجمہ: "تمہارے پاس جبرئیل آئے تھے تم کو تمہارا دین سکھانے کے لیے۔"

ظاہر ہے کہ جبرئیل نے اس وقت دین کے متعلق جو کچھ سکھلایا تھا یقیناً وہ قرآن میں شریک نہیں کیا گیا اور بھی ایک روایت کیا اکثر چیزیں اسی قسم کی بتوسط جبرئیل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئیں لیکن وہ قرآن میں شریک ہونے کے لیے نازل نہیں ہوئی تھیں اسی لیے قرآن میں شریک نہیں کی گئیں۔

اسی بنیاد پر "فی ما أنزل من القرآن" سے راوی کا مقصد یہ ہے کہ یہ مسئلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہادی مسائل میں سے نہ تھا بلکہ یہ جتلانا مقصود ہے کہ جس راہ سے قرآن نازل ہوا ہے اسی راستہ سے یہ حکم بھی اللہ تعالیٰ کے رسول تک پہنچا تھا۔ اور یہ کہ قرآن کو جس راہ کی چیز سمجھ کر پڑھا جاتا ہے اسی راہ کی چیز یہ بھی ہے اور یہی معنی ہیں "فیما یقرء من القرآن" کے یعنی جو کچھ قرآن میں پڑھا جاتا ہے جس راہ سے وہ آیا اسی راہ کی چیز یہ بھی ہے۔

رجم کی روایت:

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ دلچسپ وہ روایت ہے جس میں رجم کا ذکر ہے یعنی شادی شدہ آدمی سے زنا کا صدور جب ہو تو سنگساری کا حکم اسلام میں جو دیا گیا ہے اس

کے متعلق بخاری شریف (ج:۲ ص:۱۰۰۹) میں ایک طویل حدیث اس سلسلہ میں پائی جاتی ہے، ماحصل جس کا یہ ہے کہ حج کے موسم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر ملی کہ بعض لوگ ان کی وفات کے بعد خلافت کے متعلق کچھ منصوبے پہلے سے پکا رہے ہیں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے انتخاب پر کچھ اعتراض بھی کرتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے تو چاہا کہ حج ہی کے موقع پر ایک تقریر کریں، لیکن بعد کو رائے بدل گئی اور مدینے پہنچ کر آپ نے جمعہ کے خطبہ میں ان ہی باتوں کا ذکر فرمایا جن کا تذکرہ حج کے موقع پر کرنا چاہتے تھے، یہ بڑی طویل تقریر ہے جس میں بہت سی باتیں بیان کی گئی ہیں اسی میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا ذکر آپ نے فرمایا اور مسلمانوں کو اس کی وصیت کرتے ہوئے کہ میرا کیا ٹھکانہ ہے آج ہوں کل نہ ہوں اس لیے چند ضروری باتوں کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں۔ اسی سلسلہ میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ رجم کا قانون اگرچہ قرآن میں نہیں پایا جاتا مگر میں گواہی دیتا ہوں کہ:

"کان مما أنزل الله۔"

ترجمہ: "یہ قانون بھی ان ہی باتوں میں سے ہے جنہیں اللہ نے نازل فرمایا۔"

پھر یہ بھی فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قانون کو ہم نے سیکھا پڑھا اور یاد کیا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل بھی کیا اور آپ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا۔ اسی کے بعد آپ نے زور دے کر کہا کہ قرآن میں نہ ہونے کی وجہ سے کسی کو یہ مغالطہ نہ ہو کہ یہ خدا کے نازل فرمودہ قوانین میں نہیں ہے بلکہ یہ خدا ہی کا برحق اور اسی کا واجب کیا ہوا قانون ہے۔ آخر میں فرمایا کہ یوں چاہیے کہ مرد ہوں یا عورت شادی شدہ ہونے کے بعد جو بھی زنا کا ارتکاب کرے اور ثابت ہو جائے تو اس کو رجم (سنگسار) کیا

جائے، یہ عجیب بات ہے کہ اسی کے بعد آپ نے یہ بھی فرمایا:۔

"انا کنا نقرأ فیما نقرأ من کتاب الله ان لا ترغبوا عن

اٰبائکم فانه کفر بکم ان ترغبوا عن اٰبائکم۔"

ترجمہ: "جس راہ کی چیز سمجھ کر کتاب اللہ (قرآن) کو ہم پڑھتے تھے کہ اپنے

باپوں سے اعراض نہ کرو، کیونکہ اپنے باپوں سے اعراض تمہارے لیے کفر ہے۔"

پھر آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی منع فرمایا ہے کہ جیسے عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں اور حد سے تجاوز کر جاتے ہیں تم بھی میری تعریف میں اس قسم کے اطراء و غلو سے کام نہ لینا۔

میں نے اس دوسری بات کو عجیب بات اس لیے کہا کہ رجم کے متعلق تو صرف "مما انزل الله" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا مگر یہ کہ باپوں سے اعراض کرنے کے متعلق جو الفاظ آپ نے فرمائے اس میں تو "کنا نقرأ فیما نقرأ من کتاب الله" (۱) کے الفاظ ہیں لیکن ان الفاظ کے متعلق مسلمانوں میں اس کا کسی زمانہ میں کسی نے بھی چرچا نہ کیا جیسا کہ رجم والے الفاظ کے متعلق پھیلا دیا گیا کہ پہلے وہ قرآن میں موجود تھے اور طرفہ تماشا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن سے الفاظ تو خارج کر دیئے گئے لیکن قانون کو جیسا کہ سب جانتے ہیں قیامت تک کے لیے باقی رکھا گیا اور بس کرنے والوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ الفاظ کا ایک مجموعہ بھی بنا لیا گیا جو مدرسوں میں آج تک مشہور ہے کہا جاتا ہے کہ قرآن میں قانون رجم کے متعلق یہی الفاظ تھے، الفاظ کا وہ مجموعہ یہ ہے:۔

---

(۱) یعنی ہم پڑھتے تھے اس کو اسی سلسلہ میں جس سلسلہ میں قرآن پڑھتے ہیں۔۱۲

"الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھا." (۱)

ترجمہ: "کوئی بڈھا اور بڈھی جب زنا کریں تو دونوں کو سنگسار کر دو۔"

بعضوں میں "البتۃ" کے لفظ کا اضافہ بھی پایا جاتا ہے۔ بہرحال صحیحین (بخاری ومسلم) میں یہ "الشیخ والشیخۃ" والی روایت نہیں پائی جاتی بلکہ ابوداؤد، ترمذی وغیرہ میں بھی نہیں ہے ماسوا اس کے اس روایت کے راویوں کی حالت کیا ہے اس سے اگر قطع نظر بھی کر لیا جائے پھر بھی بقول مولانا گیلانی اس کو قرآن مجید کا گویا معجزہ ہی خیال کرنا چاہیے کہ روایت کے الفاظ ہی سے اس قانون کی تردید ہو جاتی ہے جس کے لیے بنانے والوں نے ان عجیب وغریب الفاظ کے مجموعہ کو بنایا ہے، آپ سن چکے ہیں اور دنیا جانتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے الفاظ ابھی گذرے ہیں کہ رجم کا قانون شادی شدہ مرد اور عورتوں کے لیے ہی ہے مگر اب ذرا روایت کے ان الفاظ پر غور کیجئے 'الشیخ' (بڈھا) 'والشیخۃ' (بڈھی) ایسے الفاظ ہیں جن کے لیے ضروری نہیں کہ وہ شادی شدہ ہوں، پھر نتیجہ کیا ہوا ایسے بڈھے اور بڈھی عورت جن کی شادی نہیں ہوئی ہوان الفاظ کی بنیاد پر چاہیے کہ ارتکاب گناہ کے جرم میں سنگسار کر دیے جائیں اور جوان مرد اور جوان عورت شادی شدہ ہی کیوں نہ ہوں چونکہ الشیخ اور الشیخۃ کے الفاظ ان پر صادق نہیں آتے اس لیے رجم کا قانون ان کے لیے باقی نہ رہا اور بھی کیا رجم کا قانون اس روایت کی بناء پر صرف اسی زنا سے متعلق ہوگا جب بڈھے اور بڈھی ہوں لیکن ایک طرف بڈھا اور دوسری طرف جوان یا

---

(۱) مستدرک حاکم ج:۵ ص:۳۵ میں یہ روایت متعدد طرق سے نقل کی گئی ہے جو صحیح اور حسن کے درجے کی ہیں۔ امام حاکم اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں: "ھذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاہ" اس حدیث کی سند صحیح درجہ کی ہے اور امام بخاری و مسلم نے اپنی صحیح میں ذکر نہیں کی ہے۔ اسکے علاوہ بھی متعدد کتب حدیث میں ہے۔

برعکس ہو تو اس پر بھی یہ قانون نافذ نہ ہوگا۔ دوسری بات تو یہ ہے کہ شیخ و شیخہ عربی زبان میں عمر کے جس حصے کی تعبیر ہے وہ عمر کا وہ زمانہ ہے جس میں عموماً جنسی خواہش کا زور کم ہی نہیں بلکہ بسا اوقات مفقود بلکہ حد نفرت کو بھی پہنچ جاتا ہے۔ جوان عورت کے ساتھ تو ممکن ہے کوئی بڈھا مشغول ہو جائے یا بالعکس میں بھی امکان ہے مگر جب دونوں ہی بوڑھے ہوں یعنی الشیخ والشیخہ بن چکے ہوں تو زنا کے صدور کا امکان ہی کیا باقی رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سرے سے رجم کا قانون ہی غیر مکمل بن کر ان الفاظ کی بنیاد پر رہ جاتا ہے۔ کیا تماشا ہے کہ رجم کے قانون کو ثابت کرنے کے لئے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا گیا جس سے اس قانون کی بنیاد ہی منہدم ہو کر رہ گئی۔ کیسی عجیب بات ہے۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس قانون رجم کا ذکر فرماتے ہوئے صاف صاف لفظوں میں فرماتے تھے کہ قرآن میں اس کو داخل کر کے،

"ان ازید فی کتاب اللہ"

ترجمہ: "میں اللہ کی کتاب میں اضافہ کرنے کا عمل کر دوں گا"

اس کے ساتھ یہ بھی فرماتے کہ اس کا خطرہ اگر نہ ہوتا تو قانون کی اہمیت کا تقاضہ تھا کہ قرآن کے کم از کم حاشیہ پر اس کو لکھ دیا جاتا۔ عمر رضی اللہ عنہ جس کے متعلق کہہ رہے ہوں کہ قرآن میں اس کے داخل کرنے سے اضافہ ہوگا یعنی جو چیز قرآن کا جز نہیں ہے وہ قرآن کا جز بن جائے گی مگر لوگ ہیں کہ یہی کہتے جا رہے ہیں کہ قرآن ہی کا جز وہ رجم کا قانون تھا۔(۱) اور مغالطہ کس سے ہوا؟ صرف "کان مما انزل" کے الفاظ سے ہوا مگر

(۱) حقیقت یہ ہے کہ جلد (تازیانے) کی قرآنی سزا جو زنا کے متعلق قرآن میں نازل ہوئی تھی اس کی بنا پر آدمی کنوارا (غیر محصن) ہی کیوں نہ ہو اگر زنا کا مجرم ہوگا تو جلد (تازیانے) کی سزا کا مستحق ہو جاتا ہے مگر قدرتاً یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شادی شدہ یعنی محصن زنا سے بچنے والی چیز یعنی (جاری ہے)

آپ دیکھ چکے کہ ان الفاظ کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہے۔ آخر اسی روایت میں تو "رغبة عن الآباء" والے حکم کو بھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی نے اس سے بھی زیادہ تیز تر الفاظ میں "کنا نقرأ فيما نقرأ من كتاب الله" کے ذریعے اپنا مطلب ادا کیا ہے۔ لیکن اس کا چرچا لوگوں میں کیوں نہیں پھیلا، بڑے بڑے مولوی بھی شاید اس کا استحضار نہ رکھتے ہوں حالانکہ اس قسم کے الفاظ کا مطلب جو کچھ ہوتا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیان کے اسی حصہ سے چاہیے تھا کہ لوگ سمجھ لیتے۔ مگر سمجھنے کا جب ارادہ ہی نہ کیا جائے تو اس کا کیا علاج ہے، یہی روایت کیا بلکہ بیر معونہ کا حادثہ کہ قرآن کی کافی تعداد جو اس حادثہ سے شہید ہوئی تھی، حدیثوں میں اس قصہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ بیچارے جماعت قراء ہی شہید ہو گئے تو:

"فاخبر جبرئيل عليه السلام النبي صلى الله عليه وسلم انهم

= بیوی رکھتے ہوئے بھی اس جرم کا اگر مجرم ہو تو اس کا جرم اس خاندانی سے بھی زیادہ سخت ہے جو اپنی جنسی خواہش کی تسکین کے ذریعے (بیوی) سے محروم ہے گویا شادی شدہ (محصن) اس غیر شادی شدہ سے بھی زیادہ شرارت کا مرتکب ہے، اسی لیے غیر شادی شدہ زنا کی جو سزا ہے یعنی تازیانے کی سزا سے زیادہ سخت سزا کا طالب خود اس کا جرم ہے زنا کے جرم سے زیادہ شادی شدہ آدمی کے اندر جو شرارت اور بے باکی کی کیفیت پائی جاتی ہے یہی کا اقتضاء یہ ہوا کہ اس کی سزا میں سختی کا اضافہ کر دیا جائے۔ رجم اسی قدرتی اقتضاء کی تکمیل ہے۔ اسی لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی جیسا کہ بخاری (ج:۲، ص:۱۰۰۶) میں ہے فرمایا کرتے تھے کہ "رجمتها بسنة رسول الله" یعنی محصن کی سزا رجم جو میں نے دی ہے تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی بنیاد پر دی، جس کا مطلب یہی ہوا کہ گویا آئی قانون پر اس سزا کی بنیاد قائم نہیں ہے۔ رہا یہ کہ قرآن میں ناسخ و منسوخ کا حکم کیوں نہیں، اور زنا کے جرم میں احصان کی وجہ سے جو سختی بڑھ جاتی ہے اس حکم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے سپرد کیوں کر دیا گیا تو قرآنی نزاکتوں سے جو واقف ہیں اس کی مصلحت کو سمجھ سکتے ہیں جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے ۱۲۔

قرآن کی مشہور آیت ہے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ "ھلوع" کا مطلب وہی ہے جسے صحابی نے مذکورہ بالا الفاظ میں ادا کیا پھر اسی مضمون کو انہوں نے قرآن کی طرف منسوب کر کے جو بیان کیا تو اس سے یہ کیسے سمجھ لیا گیا کہ ان کا خیال یہ تھا کہ بجنسہ یہی الفاظ قرآن میں پائے جاتے ہیں؟ آخر روزمرہ کی یہ بات ہے کہ عام گفتگو میں، وعظوں میں، تقریروں میں لوگ مضمون یوں کر کے کہتے ہیں کہ ایسا قرآن میں آیا ہے۔ لیکن یہ کتنی بڑی حماقت ہوگی اگر سننے والا قرآنی آیت کے حاصل مطلب کے بجنسہ ان ہی الفاظ کو قرآن میں تلاش کرنے لگے۔

(۲) مغالطوں کی اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ قرآن سناتے ہوئے بعض دفعہ صحابی بیچ میں تفسیر طلب الفاظ کی تفسیر بھی کرتے چلے جاتے تھے، ہندوستانی علماء بھی بکثرت اس کام کو کرتے ہیں لیکن چونکہ ان کے تفسیری الفاظ اردو میں ہوتے ہیں اس لیے سب جانتے ہیں کہ درمیان کے الفاظ قرآنی الفاظ کی تفسیر سے تعلق رکھتے ہیں لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ صحابہ کی مادری زبان بھی چونکہ وہی تھی جو قرآن کی زبان ہے اس لیے بعضوں نے تفسیر کے ان عربی الفاظ سے یہ غلط نفع اٹھایا اور مشہور کر دیا کہ فلاں سورۃ میں موجودہ الفاظ کے ساتھ فلاں فلاں الفاظ پائے جاتے تھے جو اب قرآن سے خارج ہو گئے ہیں۔ حضرت ابی بن کعب صحابی رضی اللہ عنہ کے ساتھ یہی صورت پیش آئی یعنی وہ سورۃ "البینۃ" سنا رہے تھے، جب قرآن کے الفاظ:

= قرآن میں یہاں ہے، میں نے عرض کیا کہ حالانکہ "یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ" (الفاطر: ۱۵) (اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو) اس کا مطلب یہی تو ہے کہ گھر والے کہہ رہے تھے مگر محققین نے یہ دعویٰ "ان الفاظ کو قرآن میں تلاش" کیا (مناظر احسن گیلانی)

"وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ" (البینہ: ۵)

ترجمہ: "اور نہیں حکم دیا (ان کو) لیکن صرف اس کا کہ پوجتے رہیں اللہ کو دین کو اسی کے لیے خالص بنا کر بالکلیہ اسی کی طرف جھکتے ہوئے۔"

پہنچو تو "مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ" یعنی دین کو اللہ کے لئے خاص بنانے کا مطلب یہ ہے اسی کو سمجھانے کے لئے جس کا حاصل یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی مبارک اور اس کی خوشنودی کا حاصل کرنا بھی "الدین" اور مذہب کی خاص روح اور خالص منشاء ہے۔ باقی بعض لوگ جیسے رنگ، نسل، وطن، زبان وغیرہ کو فرقہ واری حد بندیوں کا آلہ بنا لیتے ہیں اسی طرح ایک طریقہ تقسیم کا دین اور مذہب کو بھی بنالیا جاتا ہے اس وقت جو نے رضاء حق کے حصول زندگی کا محض ایک ذریعہ بن کر مذہب رہ جاتا ہے۔ اس زمانہ میں یہودیت، نصرانیت، مجوسیت وغیرہ مذاہب مرضی حق تک پہنچنے کے نہیں بلکہ نئی عصبیت کے ابھارنے کے ذرائع بنے ہوئے تھے۔ اسی توضیحی و تفسیری مطلب کو عربی زبان میں حضرت ابی بن کعب نے ان الفاظ میں ادا کیا:

"انه الحنيفة المسلمة لا اليهودية ولا النصرانية ولا المجوسية۔"

ترجمہ: "دین خدا کے نزدیک وہی معتبر ہے جس میں حنیفیت (یعنی خدا کی طرف یکسوئی کی کیفیت ہو جو حنف کا مطلب ہے) اور مسلمہ ہو (یعنی اپنے آپ کو بالکلیہ خدا کے سپرد کر دیا جائے) نہ یہودیت نہ نصرانیت نہ مجوسیت (یعنی ان دینی ناموں کو انسانیت کی تقسیم کا ذریعہ بنانا) یہ ان لوگوں کا کام نہیں ہو سکتا جو اپنے دین کو واقعی صرف خدا کے لیے خالص بنانا چاہتے ہیں اور مخلص ہو کر دینی زندگی گزارنا چاہتے

ہیں۔"

مسند احمد (ج: ۵، ص: ۱۳۳) کے حوالے سے "جمع الفوائد" (ج ۳، ص: ۲۲۲) میں نقل کیا ہے کہ ان الفاظ کے بعد:

"ثم ختمها بما بقی من السورة."

ترجمہ: "پھر ابی رضی اللہ عنہ نے (ان الفاظ کے) بعد سورۃ البینہ کو ختم کیا۔"

بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ درمیان کے تفسیری الفاظ کو فرمانے کے بعد حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے سورۃ کو ختم کیا۔ واقعہ کی صورت کل یہی ہے۔ آپ ہی بتائیے کہ مغالطے کے سوا اس کو اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اگر حضرت ابی کے ان تفسیری الفاظ کے متعلق محض اس لیے کہ وہ عربی زبان کے الفاظ ہیں یہ وسوسہ دلوں میں کوئی ڈالے کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے نزدیک قرآن ہی کے اجزاء (العیاذ باللہ) یہ الفاظ تھے۔ تو واقعہ یہ ہے کہ عربی زبان سے تھوڑا بہت بھی لگاؤ جو رکھتا ہے سننے کے ساتھ ہی سمجھ سکتا ہے کہ زرہ بفت میں یہ ٹاٹ کا پیوند بن جائے گا اور یہی حال ان الفاظ کا نہیں بلکہ اور بھی جن جن روایتوں میں ان تفسیری و تشریحی الفاظ کا ذکر کیا گیا ہے بذات خود بتا رہے ہیں کہ قرآنی عبارت کے الفاظ اور ان میں کھلا ہوا فرق ہے مگر اس کے لیے عربی ادب کے ذوق صحیح کی ضرورت ہے۔

۳۔ اسی سلسلہ کی بعض غیر مستند رنگین روایتوں میں تذکرہ کیا گیا ہے کہ:

"ان ابن مسعود کان ینکر کون سورة الفاتحة والمعوذتین من القرآن" (تبیان الجزائری، ص: ۹۶)

ترجمہ: "حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سورۃ فاتحہ یعنی الحمد اور معوذتین یعنی "قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ" اور "قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ" والی سورتوں کے

متعلق کہتے تھے کہ یہ قرآن کے اجزا نہیں ہیں۔"

بالفرض ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف مان لیا جائے کہ یہ انتساب صحیح بھی ہو اور قرآن میں جو تواتر کی قوت پائی جاتی ہے اس کا مقابلہ یہ تاریخی روایت فرض کر لیجیے کر بھی سکتی ہو جب بھی کیا اس کا وہی مطلب ہے جو ظاہر الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ جس کا قرآنی نام "السبع المثانی" (۱) ہے قرآن میں اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:۔

"وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ." (الحجر:۸۷)

ترجمہ: "ہم نے تم کو (اے پیغمبر) سبع مثانی (یعنی سورۂ فاتحہ دی) اور قرآن عظیم دیا۔"

جس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ سورۂ فاتحہ کی حقیقت "القرآن العظیم" کے مقابلہ میں جداگانہ رکھتی ہے جس کی وجہ ظاہر بھی ہے کہ سورۂ فاتحہ کی حیثیت درخواست کی ہے جو خدا کے دربار کی حاضری کے وقت یعنی نماز میں بندے کی طرف سے خدا کی بارگاہ میں پیش ہوتی ہے اور "الٓمٓ" سے "والناس" تک اسی کا جواب دیا گیا ہے۔ (۲) ابن

(۱) سبع کے معنی سات (۷) کے ہیں اور مثانی ایسی چیز کی تعبیر ہے جو دو دو دفعہ دہرائی جائے چونکہ سورۂ فاتحہ سات آیتوں پر مشتمل ہے اور اس کی خواندگی نہ تو فرض و ستور یعنی نماز میں پڑھنے کا قاعدہ یہی ہے کہ کم از کم دو دفعہ دہرائی جائے اسی لیے ہر دو یعنی ایک رکعت کی نماز ممنوع ہے مثانی کہنے کی وجہ یہی ہے۔

(۲) مفصل حالت اس روایت کی جو کچھ ہے یہ مسئلہ اور سورۂ فاتحہ و معوذتین جن خصوصی حقائق و معارف پر مشتمل ہیں حضرت الاستاذ گیلانی کی کتاب اور ان کے تفسیری محاضرات میں آپ کو جس کی پوری تفصیل مل سکتی ہے۔

مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی اگر اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ فرمایا ہو کہ سورۂ فاتحہ "والقرآن العظیم" سے الگ حیثیت رکھتی ہے تو اس کا یہ مطلب سمجھ لینا کیسے صحیح ہوگا کہ سورۂ فاتحہ کے الفاظ کی وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی طرح نہیں ہوئی تھی جیسے باقی قرآن کی وحی ہوئی ہے کہ وحی ہونے میں تو دونوں میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ سورۂ فاتحہ اپنی جداگانہ حیثیت جو رکھتی ہے یعنی بندے حق تعالیٰ کے دربار میں جو معروضہ پیش کریں، حق تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے اس معروضہ یا درخواست کی عبارت بھی مرتب کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی فرمادی۔(۱)

انہی روایتوں میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ معوذتین کے متعلق کہا کرتے تھے:۔

"انما امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یتعوذ بھما۔"

ترجمہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا ہے کہ ان دونوں سے تعوذ (پناہ گیری) کا کام لیا جائے۔"

مطلب یہ تھا کہ معوذتین (یعنی "قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ" اور "قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ") ان دونوں سورتوں کا نزول تعوذ (پناہ گیری) کے لئے ہوا ہے اس لیے قرآن کی دوسری سورتوں کے مقابلہ میں ان کی جداگانہ حیثیت ہے، میرے نزدیک تو ان الفاظ سے معوذتین کی اہمیت کو ابن مسعود رضی اللہ عنہ واضح کرنا چاہتے تھے اور واقعہ بھی یہی

---

(۱) دنیا کی دفتری حکومتوں میں بھی بسا اوقات یہی کیا جاتا ہے کہ درخواست کی عبارت حکومت خود جاری کرتی ہے اسی کو چھاپ کر دفتر میں رکھ دیا جاتا ہے، درخواست گزار ان مطبوعہ فارم پر دستخط کرکے داخل کردیا کرتے ہیں۔۱۲

ہے کہ کسی قسم کی مصیبت دنیا میں پیش ہو، ان دونوں سورتوں کے مضامین پر غور کرنے سے تسلی مل جاتی ہے۔ بہرحال اگر ان روایتوں کے تاریخی ضعف اور اسنادی کمزوریوں سے قطع نظر بھی کر لیا جائے جب بھی ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس بیان کا یہ مطلب لینا کہ وہ ان سورتوں کو حق تعالیٰ کے فرمودہ اور نازل کردہ الفاظ نہیں سمجھتے تھے، قطعاً ان پر بہتان ہے اور بدترین قسم کی مغالطہ بازی ہے کیا کسی حیثیت سے بھی کسی کی سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے کہ کوئی اور سورۃ نہیں بلکہ سورۂ فاتحہ جیسی سورۃ جو نماز کی ہر رکعت میں دن کے پانچ (۵) وقتوں میں دہرائی جاتی ہے اسی کو سمجھتے تھے کہ قرآن کا جز نہیں ہے کچھ اسی قسم کا مغالطہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ صحابی کی طرف اس روایت کے متعلق ہوا جس میں یہ ہے کہ ان کے قرآنی نسخہ میں وہ دونوں دعائیں جو قنوت میں عموماً پڑھی جاتی ہیں لکھی ہوئی تھیں اسی بناء پر یہ غلط فہمی پھیلانے کی بھی بعضوں نے کوشش کی کہ ان دعاؤں کو ابی بن کعب رضی اللہ عنہ قرآن کے اندر داخل سمجھتے تھے یعنی جیسے دوسری قرآنی سورتیں ہیں اسی طرح دو سورتیں قرآن کی یہ دونوں دعائیں بھی ہیں۔

میں پوچھتا ہوں آج بھی تو قرآن کے آخر میں مختلف قسم کی دعائیں خصوصاً ختم قرآن کی دعاء، عموماً لکھی ہوئی رہتی ہے کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ دعائیں قرآن میں شریک ہیں۔ اگر روایت صحیح بھی ہو تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ اہمیت کی وجہ سے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے اپنے قرآن کے آخر میں ان دونوں مسنون دعاؤں کو لکھ لیا ہوگا اور سچ تو یہ ہے کہ روایت ہی بے سروپا ہے میں نے بھی اس کا ذکر صرف تکمیل مضمون کے لئے کر دیا ورنہ یہ روایت تو اس قابل بھی نہیں تھی کہ کسی سنجیدہ علمی مقالہ میں جگہ دی جائے۔

ایک ذیلی بحث اور خاتمہ:

سوال: گیلانی نے اپنی کتاب کو جن مباحث پر ختم کیا ہے ان کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ قرآن تو خیر خدا کی کتاب ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کی تصنیف کردہ کتابوں مثلاً سعدی کی گلستان ہی کو لیجئے یا کوئی دوسری کتاب ان کے پڑھنے والوں کو کبھی نہیں دیکھا کہ پڑھنے سے پہلے وہ اس کی توہ میں لگے ہوں کہ مصنف نے کتاب کے کس باب کو پہلے لکھا اور کس کو بعد میں یا باب کی فصلوں کی عبارتوں میں کس عبارت کی پرداخت پہلے ہوئی اور کون بعد میں بلکہ عام قاعدہ یہی ہے کہ مصنف کی طرف سے کتاب پڑھنے والوں کے سامنے جس شکل میں پیش ہوتی ہے اسی آخری شکل کو کتاب کی واقعی شکل قرار دے کر لوگ پڑھنا پڑھانا شروع کر دیتے ہیں۔

اسی عام دستور کے مطابق ظاہر ہے کہ قرآن کی بھی واقعی شکل اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ جس حال میں پیش کرنے والے نے دنیا کے حوالے قرآن کو کیا بس یہی قرآن کی اصلی شکل ہے، یہی سمجھا بھی گیا، ابتداء سے اسی وقت تک اسی شکل میں قرآن نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا ہوا چلا آ رہا ہے لیکن یہ ایک عجیب مضحکہ خیز بات ہے، لیکن چند دن سے یورپ کے مستشرقین نے دنیا کو قرآن کے متعلق ایک تماشے کی طرف متوجہ کیا یعنی اس کتاب کی ہر سورۃ کی ہر ہر عبارت کا ہر فقرہ کب نازل ہوا اس کا پتہ چلانا چاہیئے، اور کہا جاتا ہے کہ قرآن کی صحیح مرتب شکل وہی ہو سکتی ہے جو نزولی ترتیب کی روشنی میں قائم کی جائے۔ مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا تصنیفی کاروبار کرنے والوں کا عام قاعدہ ہے کہ اپنی تصنیف کو آخری

شکل میں مرتب کرنے سے پہلے متفرق قسم کی یادداشتوں میں مواد کو نوٹ کرتے رہتے ہیں
اور بعد کو ان ہی یادداشتوں کی مدد سے آہستہ آہستہ اپنی کتاب کو مکمل کرتے ہیں بلکہ یہ
اتفاق بھی کیا جاتا ہے کہ کتاب کے جس حصہ کے متعلق مواد کو دیکھتے ہیں کہ فراہم ہو چکا
ہے تو پہلے اسی حصہ کو لکھ لیتے ہیں یوں ہی سہولتوں کے لحاظ سے بتدریج یہ کام جب پورا
ہو جاتا ہے تب آخری شکل میں کتاب کو مرتب کرکے دنیا کے سامنے دستور ہے کہ مصنفین
اپنی کتاب پیش کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا یہی آخری شکل اس کتاب کی
اصلی اور واقعی شکل قرار دی جاتی ہے اور کسی کے دل میں اس کا خطرہ بھی نہیں ہوتا کہ مصنف کو کن
کن مراحل سے اپنی تصنیف کے اس جدوجہد میں گزرنا پڑا، اس کا پتہ چلایئے اور اس سلسلہ
میں مصنف کی پرانی کاپیوں اور ان بستوں کو ٹٹولیے جن میں اس کی یادداشتیں رکھی جاتی تھیں
اور کاغذ سیاہی وغیرہ کی کہنگی اور تازگی کو دیکھ دیکھ کر فیصلہ کیجئے کہ ان یادداشتوں میں تاریخی
طور پر کس کو مقدم اور کس کو موخر قرار دیا جائے۔ یہ کہ مصنف نے اپنی کتاب کے کس حصے
پہلے لکھا یا اور کس حصہ کی تکمیل بعد کو ہوئی۔ بالفرض اس قسم کی ساری سر بحثیں کی ان غیر
ضروری تحقیقوں میں کوئی خواہ مخواہ وقت ضائع بھی کرے تو ایک قسم کے غیر ضروری خبط کے سوا اور اسے کیا
سمجھا جا سکتا ہے تاہم انسانی تصنیفات کے متعلق سراغرسانی کی اس غیر ضروری مہم کا حسن
ہے کچھ قابل فہم بھی ہو۔ قریب آدمی زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف حالات سے گزرتا رہتا
ہے۔ کبھی انشراح قلب نصیب اطمینان کی حالت میں رہتا ہے کبھی انقباض کا وقت دماغی میں
مبتلا ہو جاتا ہے یا اور اسی قسم کے دوسرے نفسیاتی کیفیات و اثر جیسے زندگی کے تمام شعبوں پر
پڑتے ہیں انسان کے تصنیفی کاروبار بھی ان سے متاثر ہوں تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے اور
کچھ نہیں تو یہی پتا کہ ہے کہ کتاب کے کس حصہ کو نشاط اور ملال کی حالت میں مصنف نے لکھا

ہے اور کن حصوں کی تکمیل اقتباس وکوفت دماغی کے زمانے میں ہوئی، اس نزول سے اس کا پتہ چل جائے۔ مگر اللہ میاں کے متعلق تو مزاجی اور دماغی اتار چڑھاؤ کی اس کیفیت کی گنجائش نہیں۔

مگر عجیب بات ہے۔ غیر تو غیر خود مسلمانوں کا ایک حصہ جو قرآن کو خدا کی کتاب مانتا ہے ادھر کچھ دنوں سے اس لایعنی، غیر ضروری مشغلے میں یورپ کے مستشرق نما پادریوں کے اغوائی اشاروں سے الجھ گیا ہے۔ خود بھی کچھ اسی میں الجھا ہوا ہے اور چاہتا ہے کہ جس مسئلہ کا مسلمانوں کے دل پر کسی زمانہ میں بھی کسی قسم کا کوئی خطرہ بھی نہیں گزرا تھا اسی مسئلہ میں الجھا دے۔ بڑھتے بڑھتے بعض تو یہاں تک پہنچ گئے کہ قرآن کا مطلب ہی مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک کہ موجودہ ترتیب کو الٹ پلٹ کر نزولی ترتیب پر قرآن کو مرتب کر کے نہ پڑھا جائے۔ بقول مولانا گیلانی پادریوں کی بات تو کچھ سمجھ میں بھی آتی ہے کیونکہ وہ قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی افکار و خیالات کا العیاذ باللہ مجموعہ سمجھتے ہیں اس لیے نزولی ترتیب کے پتہ چلانے کا فائدہ یہ بتاتے ہیں کہ اس ذریعہ سے ہم ایک زبردست دماغ کی ترقی، بلکہ پاکیزہ روح کی کمزوری و توانائی اور ایک بڑے انسان کی ناگزیر نیرنگیوں کو دیکھنے لگتے ہیں۔ (۱) لیکن خیال تو کیجئے کہ ایک مسلمان سے بے چارہ جو قرآن کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں بلکہ خالق کائنات کی براہ راست کتاب یقین کرتا ہے کیا اس نزولی ترتیب کی جستجو کی حماقت میں پانچ نکلنے کے بعد اللہ میاں کی پاکیزہ روح کی "کمزوریوں اور ناگزیر نیرنگیوں" کا تماشا دیکھنا چاہتا ہے؟ یا نزولی ترتیب کی جستجو کی

---

(۱) لیکن پون خطبات الاحادیث رسول ص ۱۰۲

دعوت دینے والے کیا بچے پیدا کرنے والے مالک کی ان ہی فطری حرکات کا تماشا خود بھی اور مسلمانوں کو بھی دکھانا چاہتے ہیں؟

میں نے جیسے عرض کیا، انسانی تصنیفوں کے متعلق بھی جب اس قسم کی کریدیوں کا مالیخولیا دماغوں میں پیدا نہیں ہوتا تو العیاذ باللہ حق سبحانہ تعالیٰ کی کتاب کے متعلق اس سوال کے اٹھانے کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں؟ اور کوئی پوچھے بھی تو میں نہیں سمجھتا کہ انسانی تصانیف کے متعلق بھی ان باتوں کا پتہ چلانا آسان ہے کہ مصنف کو اپنی اس کتاب کی ترتیب کے سلسلہ میں کن مرحلوں سے گزرنا پڑا، یادداشتوں میں کون سی یادداشت پہلے نوٹ ہوئی اور کون سی بعد میں یا کتاب کا کونسا حصہ پہلے لکھا ہوا اور کون سا بعد میں قرآن کے ساتھ مسلمانوں کی غیر معمولی دلچسپیوں سے جہاں بہت سی عجیب و غریب چیزیں قرآن کے متعلق پیدا ہو گئی ہیں، مثلاً اس کتاب کے ایک ایک حرف اور حروف کے اعراب یعنی زیر، زبر، پیش سب ہی کو ثواب کا کام سمجھ کر گن لیا گیا ہے اور جو کچھ اس سلسلے میں تیرہ سو برس کی طویل مدت میں مسلمان کرتے چلے آئے ہیں ایک مستقل کتاب کا وہ مضمون ہے۔ غیر معمولی دلچسپیوں کے اسی ذیل میں تمام کتابوں کے مقابلہ میں صرف قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جس کے کل تو نہیں لیکن معقول اور معتدبہ حصے کے متعلق مسلمانوں میں ایسی روایتیں پائی جاتی ہیں جن سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب کی کونسی سورۃ کس مقام میں اتری یعنی مکہ میں یا مدینے میں، اسی طرح انہی روایتوں میں اس کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ فلاں آیت یا آیتوں کا مجموعہ فلاں مشہور واقعہ کے بعد اترا، شان نزول کی اصطلاح ان ہی معلومات کے متعلق مسلمانوں میں مروج ہے۔

بہرحال اتنی بات درست ہے کہ ان روایتوں کی مدد سے سورتوں کی کافی تعداد

کے متعلق اس کا پتہ چلا لیا گیا ہے کہ وہ مکہ میں اتری تھیں یا مدینہ میں اور تھوڑی بہت آیتوں کے متعلق بھی کوئی چاہے تو اس قسم کی معلومات فراہم کر سکتا ہے لیکن ان ساری معلومات کے بعد بھی مسلمانوں نے نہیں بلکہ یورپ کے ان ہی پادریوں نے جو آج کل استشراق کے نقاب چہروں پر پردہ ڈال کر یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ بجائے دینی اور مذہبی عصبیت کے ان کے کاروبار کا تعلق صرف علمی تحقیقات سے ہے ان ہی مستشرقین کا بھی جتھہ دو ڈھائی سو سال کی کدوکاوش کے بعد اس نتیجہ تک پہنچا ہے کہ:۔

"صحیح ترتیب نزول کا معلوم کرنا ناممکن ہے۔" (نولڈ کی)

برش فیلڈ جو اسی فیلڈ کا مشہور رسپاہی ہے اس بےچارے کو بھی اسی اعتراف پر مجبور ہونا پڑا کہ:۔

"میں پہلے ہی سے اس کا اقرار کیوں نہ کرلوں کہ اس سلسلہ میں (نزولی ترتیب کی جاسوسی میں) قابل اعتماد نتائج حاصل کرنے کی بہت ہی کم امید ہے۔"

(یہ فقرے پروفیسر اجمل کی کتاب سے لیے گئے ہیں جو اسی مسئلہ پر انہوں نے لکھی ہے)

اور یہ حال تو اس وقت ہے جب قرآن کی موجودہ متواتر قطعی مسلمہ ترتیب میں ترمیم کی اجازت ان روایتوں کی بنیاد پر دی جائے جو شان نزول کے سلسلہ میں ہماری کتابوں کے اندر پائی جاتی ہیں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ روایات کا جو ذخیرہ ہمارے یہاں پایا جاتا ہے اس ذخیرے میں سب سے زیادہ کمزور اور حد سے زیادہ ضعف ان روایتوں کی خصوصیت ہے جن کا تعلق قرآن کی تفسیر وغیرہ سے ہے امام احمد بن حنبلؒ کا تو اس سلسلہ میں یہ مشہور قول ہے کہ "ثلاثة ليس لها اصل التفسير والملاحم

والمغازی." (۱) یعنی روایات کا جو ذخیرہ حدیث کی کتابوں میں پایا جاتا ہے اس میں ایسی روایتیں جن کا تعلق تفسیر یا ملاحم (آئندہ پیش آنے والی جنگوں کی پیش گوئیاں) یا مغازی (عہد نبوت کی جنگی مہموں کے قصے) ہے امام احمد فرماتے تھے کہ ان تینوں قسم کی روایتوں کی کوئی صحیح بنیاد نہیں ہے۔ سیوطیؒ نے اس قول پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سب کو بے اصل قرار دینا تو مشکل ہے لیکن اسی کے ساتھ اس کا اعتراف خود سیوطیؒ نے بھی کیا ہے کہ قابل اعتماد روایتیں تفسیر کے سلسلہ میں "قلیل جدا" اور یہ "فی غایۃ القلۃ۔" (۲)

محدثین کا اس پر اتفاق ہے، تواتر و توارث کے غیر متناہی کی روشنی میں مذہبات کی معقولیت کی میں پوچھتا ہوں کہ جگنو کے دُم کی روشنی سے کیا مغلوب ہو سکتی ہے جن چیزوں کو آفتاب کی روشنی میں ہم دیکھ رہے ہیں اور جو معلومات اس روشنی میں حاصل ہوئی ہیں، کیا ان معلومات میں ترمیم کی جسارت ان چیزوں کی مدد سے کوئی کر سکتا ہے جن پر گھپ اندھیری رات میں جگنوؤں کی دُم کی روشنی میں اتفاقاً کسی کی نظر پڑ گئی یقین کیجئے کہ قرآن کی موجودہ مرتب شکل کے متعلق ہمارے علم کی عقلی کیفیت، نزولی روایات کے مقابلہ میں یہی بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ (۳)

---

(۱) اتقان جلد:۲، ص:۱۷۸

(۲) جلال الدین سیوطیؒ کے اصل الفاظ یہ ہیں "قلت الذی صح من ذلک قلیل جداً بل أصل المرفوع منہ فی غایۃ القلۃ"۔ (اتقان ج:۲، ص:۱۷۹)

(۳) نزولی روایات کی حیثیت اور سند' ان کا دوسری اسلامی روایات کے مقابلہ میں کیا درجہ ہے ایک مستقل مضمون ہے۔ سب سے پہلا مسئلہ اس سلسلہ کا یہ ہے کہ کسی آیت یا آیتوں کے کسی مجموعہ کے متعلق "صحابی" یا تابعی جب یہ کہتے ہیں کہ فلاں معاملہ میں نازل ہوئی یعنی "نزل فی کذا" کہتے ہیں تو اس کا واقعی مطلب کیا ہوتا ہے؟ شیخ الاسلام ابن تیمیہ، علامہ زرکشی صاحب "البرھان"۔ حضرت (جاری ہے)

= شاہ ولی اللہ صاحب اور دوسرے اکابر ائمہ اسلام نے تصریح کی ہے کہ جس معاملہ میں یا جس واقعہ پر قرآن کی وہ آیت صادق آتی ہے تو اس کے متعلق تعبیر کا یہ ایک طریقہ تھا یعنی یہ آیت فلاں چیز پر صادق آتی ہے اسی مفہوم کو "نزل فی کذا" کے الفاظ سے لوگ ادا کرتے تھے۔

قیامت تک پیش آنے والے واقعات پر قرآنی آیتیں عموماً صادق آتی ہیں اس لیے ہم ہر زمانے میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ آیت فلاں معاملہ یا واقعہ یا مسئلہ کے متعلق نازل ہوئی لیکن اس کا یہ مطلب کہ واقعۃً اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی صحیح نہ ہوگا دیکھو اتقان (نوع:۹، ج:۱، ص:۳۱) شاہ ولی اللہ نے "الفوز الکبیر" (۱) میں بھی یہی لکھا ہے ابن تیمیہ اور زرکشی (۲) کے اقوال اتقان میں ہیں۔ علاوہ اس کے کون نہیں جانتا کہ نزولی روایتوں سے بخاری و مسلم بلکہ صحاح ستہ کی اکثر کتابیں خالی ہیں دوسرے بلکہ زیادہ تر تیسرے درجہ کی کتابوں میں یہ روایتیں ملتی ہیں اور اس پر بھی حال ان روایتوں کا یہ ہے کہ ایک ایک آیت کے متعلق شان نزول کی روایتوں میں متعدد واقعے بیان کیے گئے ہیں ان روایتوں کی کیا حالت ہے ان کا سرسری اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اور تو اور یہ مسئلہ کہ سب سے پہلی نازل ہونے والی آیت تک کے متعلق ایک سے زائد روایتیں پائی جاتی ہیں عام طور پر اقراء کے متعلق مشہور ہے لیکن نزولی روایات کے ذخیرہ میں دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ بعض لوگ سورۂ مدثر کو بعض لوگ سورۂ الفاتحہ کو سب سے پہلی نازل ہونے والی سورۃ قرار دیتے ہیں اسی طرح کہاں نازل ہوئی؟ اس سوال کے جواب میں آپ کو سورۂ فاتحہ تک کے متعلق معلوم ہوگا کہ بجائے مکہ کے کہتے ہیں مدینہ میں نازل ہوئی اور یہ تو عام بات ہے کہ ایک ہی آیت کے متعلق پانچ پانچ چھ چھ شان نزول تک مروی ہے۔ ابن قیم نے محدثین کے اسی طرز عمل پر انہی نزولی روایتوں کی وجہ سے کہہ دیتے ہیں کہ فلاں آیت پانچ دفعہ نازل ہوئی سخت تنقید کی ہے۔ (مناظر احسن گیلانی)

(۱) ملاحظہ ہو "الفوز الکبیر" ص ۲۷۔ عبدالحکیم

(۲) علامہ زرکشی کی کتاب "البرہان" چھپ گئی ہے جو جلال الدین سیوطی کے پیش نظر ہے ملاحظہ ہو "البرہان فی علوم القرآن" (ج:۱، ص:۳۱-۳۲) عبدالحکیم

نزولی ترتیب کا ایک تاریخی لطیفہ:

اسی نزولی ترتیب کے متعلق ایک دلچسپ لطیفہ وہ بھی ہے جسے منسوب کرنے والوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب کر کے کچھ اس طرح اسے مشہور کردیا ہے کہ عوام میں گویا یہ مان لیا گیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے نزولی ترتیب پر قرآن مرتب کر کے ایک نسخہ واقعہ میں تیار کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس نزولی ترتیب کا مطلب اگر صرف یہی ہے کہ جلد بندی میں سورتوں کی یعنی ان قرآنی رسالوں کی جو ترتیب اس وقت پائی جاتی ہے یعنی پہلے سورۂ فاتحہ پھر البقرہ پھر آل عمران سے آخر الناس تک حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نسخہ میں سورتوں کی ترتیب یہ نہ تھی تو میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ اس میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کسی ایک مصنف کی چند کتابوں مثلاً سعدی کی گلستاں و بوستاں کی جلد بندی میں آپ خواہ بوستاں کو پہلے رکھوا دیجئے یا گلستاں کو ان دونوں کتابوں کے مضامین پر کوئی اثر اس کا نہیں پڑتا اور ابھی آپ کو معلوم ہوگا کہ بعض دوسرے صحابہ کے قرآنی نسخوں کے متعلق کتابوں میں لکھا ہے کہ ان میں بھی سورتوں کی ترتیب وہ نہ تھی جو اس وقت پائی جاتی ہے۔

لیکن اس نزولی ترتیب کا مطلب اگر یہ ہے کہ ہر ہر سورہ میں آیتوں کے اندر جو ترتیب اس وقت پائی جاتی ہے حضرت علی والے مرتبہ نسخے میں بجائے اس ترتیب کے کوئی اور ترتیب آیتوں میں دی گئی تھی تو اس کا مطلب اور نتیجہ کیا ہوسکتا ہے؟ اس کی دلچسپ داستان تو ابھی آپ کو معلوم ہوگی لیکن چونکہ حضرت علی کی طرف اس روایت کو منسوب کر کے مختلف قسم کی غلطیاں پھیلانے والے پھیلا رہے ہیں اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود

اس روایت کی جو واقعی حیثیت اور کیفیت ہے پہلے اس سے مسلمانوں کو مطلع کر دیا جائے۔

بقول مولانا گیلانی واقعہ صرف یہ ہے کہ روایات اور حدیثوں کی موجودہ عام کتابوں مثلاً بخاری و مسلم اور ان کے سوا صحاح کی جو دوسری کتابیں ہیں ان میں سے کسی کتاب میں یہ روایت نہیں پائی جاتی۔ حدیث کی ان کتابوں میں ہی نہیں بلکہ جن کتابوں کو حدیث کی کتابیں کہتے ہیں خواہ مخواہ ان کا مقام کتنا ہی کم ہو اور ان میں بھی یہ روایت نہیں ملتی۔ چند غیر معروف کتابیں جن کا ذکر سیوطی نے "اتقان" (ج ۱ ص ۵۹) میں کیا ہے ان کے سوا سند کے ساتھ صرف ابن سعد کی کتاب "طبقات" (ج ۲ ص ۳۳۸) میں اس وقت تک مجھے یہ روایت ملی ہے۔ کنز العمال (ج ۲ ص ۱۵۲) میں بھی اس روایت کو نقل کر کے صرف ابن سعد کا حوالہ دیا ہے جس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ صاحب کنز العمال بلکہ جلال الدین سیوطی نے رطب و یابس روایتوں کی محیط (انسائیکلوپیڈیا) جب تیار کرنی چاہی تو ان دونوں بزرگوں کو بھی غالباً ابن سعد کے طبقات کے سوا کسی کتاب میں یہ اثر نہیں ملا جسے وہ لائق ذکر خیال کرتے۔ بہرحال ابن سعد نے جن الفاظ میں اس روایت کو درج کیا ہے ان کو پڑھ لیجئے جو یہ ہیں۔

"عن محمد قال نبئت ان علیا ابطأ عن بیعة ابی بکر فلقیه ابو بکر فقال اکرهت امارتی فقال لا ولکنی آلیت بیمین ان لا ارتدی بردائی الا الی الصلاة حتی اجمع القرآن۔"

ترجمہ: "محمد (ابن سیرین) سے یہ روایت ہے کہ وہ کہتے تھے مجھے یہ اطلاع دی گئی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت میں کچھ تاخیر ہوئی تب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے

بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سورتوں کی ترتیب کا ذکر اگر اس روایت میں ہے اور روایت کے جو الفاظ ہیں ان میں یقیناً اس کی بھی گنجائش ہے تو اس وقت تو خیر کوئی بات ہی نہیں ہے جب بھی مسلمان بچوں کے پڑھانے کے لیے "عم" کے پارے کی سورتوں کی ترتیب بدل دیتے ہیں یعنی پہلے "والناس" پھر "الفلق" اور آخر میں سورہ "عم"

■ اور فلاسفہ کا ادیب اور ادیبوں کا فلسفی تھا۔ مقامات حریری کے مرزا نی کا پارٹ ادا کیا کرتا تھا اس لیے بعض لوگوں نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ وہ صوفیوں کا شیخ، فلاسفہ کا ادیب اور ادیبوں کا فلسفی تھا۔ یعنی فلسفہ والوں کے سامنے ادیب بنتا تھا اور ادیبوں کے سامنے فلسفی۔ ورنہ جیسے ابن راوندی کرایہ پر مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی طرف سے کتابیں لکھا کرتا تھا۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہی پیشہ آگے اس فیلسوف الادباء اور ادیب الفلاسفہ نے اختیار کیا تھا۔ جعلی کتابوں کے بنانے میں کمال تھا۔ لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر کے نام سے ایک طویل خط اس نے تصنیف کیا اور ظاہر یہ کیا کہ حضرت علی نے ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے جب انکار کیا تو دونوں ابوبکر و عمر نے مل کر یہ خط حضرت علی کو لکھا تھا۔ اس خط میں کہیں تو خوشامد کی باتیں تھیں اور کہیں دھمکیاں حضرت علی کو دی گئی تھیں۔ الغرض اس جعلی خط کو لکھ کر مسلمانوں میں اس نے پھیلا دیا جب فتنہ زیادہ بڑھا تو بعض لوگوں نے اس سے دریافت کیا، ایک دن راز کھول دیا کہ شیعوں کے مقابلے میں میں نے یہ جعلی خط بنایا ہے۔ حالانکہ شیعوں سے زیادہ اس میں سنیوں کے خلاف مواد تھا، ایسی باتیں ابوبکر و عمر کی طرف منسوب کی گئی تھیں جو کسی معمولی مسلمان کی طرف بھی کار برآری کے سلسلہ میں منسوب نہیں ہو سکتیں۔ اس سلسلے میں ان حضرت کے اور کارنامے بھی ہیں۔ اسی بنا پر علماء حق نے اس کے متعلق اس فیصلہ کا اپنی کتابوں میں اعلان کیا کہ یہ بڑا جھوٹا مفتری دین سے مفلس، ملاعیہ بیہودہ بکواس کرنے والا اور جن باتوں سے دینی نظام پر زد پڑتی ہو ان کے پھیلانے میں کمال رکھتا تھا۔ حافظ ابن حجر نے ذہبی کی کتاب "الفریدہ" سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں۔ ابن جوزی نے بھی لکھا ہے کہ "ابو حیان زندیق تھا، اس کی انہی عبارتوں کی وجہ سے کسی وزیر نے اس کو جلاوطن کر دیا تھا۔ اصلی نام علی بن محمد تھا۔ لکھا ہے کہ جب مرنے لگا تو اس کے شاگرد جو بستر علالت کے ارد گرد جمع تھے اور اس کی زندگی کی خصوصیتوں سے واقف تھے، گھبرا کر بیچاروں نے اللہ اللہ کی تلقین شروع کی، اور توبہ (جاری ہے)

"یتساءلون" ان پاروں میں چھاپی جاتی ہے۔

چونکہ ہر سورۃ اپنی مستقل حیثیت رکھتی ہے اس لیے ترتیب کی اس تبدیلی کا کوئی اثر معانی و مطالب پر نہیں پڑتا، اور مقصد اگر سورتوں کی آیتوں کی الٹ پھیر کا ہے، غالباً فتنہ پردازوں کی بڑی نیت بھی یہی ہے، ورنہ سورتوں کی نزولی ترتیب کے مسئلہ کو اتنی اہمیت کیوں دیتے تو قطع نظر اس سے کہ بجائے سورتوں کے یہ دعویٰ کرنے والوں کے ذمے ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس دعوے کے ثبوت کے لیے وہ کوئی قرینہ پیش نہیں کر سکتے مگر بہرحال مان لیا جائے کہ ان الفاظ کا وہی مطلب ہے جو خواہ مخواہ بلا وجہ زبردستی ان الفاظ سے نکالنا چاہتے ہیں تو اب آئیے اور دیکھیے کہ سنداً اس روایت کا کیا حال ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ محمد یعنی ابن سیرین روایت کی ابتدا کرتے ہوئے "نبئت" لفظ بولتے ہیں، یعنی کہتے ہیں کہ مجھے اطلاع دی گئی لیکن کس نے اطلاع دی؟ اس اطلاع دینے والے کا نام نہیں بتاتے، لیجیے راوی مجہول ہو گیا، اور ایسی روایت جس کے راوی کا حال تو حال نام تک معلوم نہ ہو، خود

= استغفار کے لیے اس کو ہدایت کرنے لگے۔ کہتے ہیں کہ ابو حیان نے آنکھیں کھولیں، اور سر اٹھا کر بولا کہ کیا میں کسی فوجی چوکی یا پولیس کے پاس جا رہا ہوں، مجھ کو تو "رب غفور" کے دربار میں حاضر ہو رہا ہوں۔ اسی آخری فقرے پر دم نکل گیا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوا؟ دراصل آپ کے مزاج میں شوخی اور گستاخی تھی۔ اسی سبب سے محروم رہے۔ صاحب بن عباد اور ابن العمید کے دربار میں جب تک قدرت رکھتا تھا تو لوگوں نے بیان کیا ہے کہ ان کی تعریف میں مبالغہ کرتے ہوئے یہاں تک اس نے لکھ مارا کہ یہ دونوں اگر نبوت کا دعویٰ کرتے تو ان پر وحی نازل ہونے لگتی اور شریعت نئی ہو جاتی۔ مسلمانوں کے دینی اختلافات کا خاتمہ ہو جاتا۔ مقصد نقلی حدیثوں کے مشہور کرنے میں اس نے خاص شہرت حاصل کی جن میں حضرت علی والی یہ روایت بھی ہے یعنی قرآن کی نزولی ترتیب کی وجہ سے بیعت سے رکے رہے۔
(دیکھو لسان المیزان ج: ۷ ص ۳۷۰ تا ۳۷۱) مناظر احسن گیلانی۔

سوچیے کہ اس کی قیمت کیا باقی رہتی، یہ حال تو اصل روایت کا ہے، پھر روایت کو ختم کر کے مزید اضافہ جو ترمذی ابن سیرین نے اپنی طرف سے جو کیا ہے اور اسی اضافہ میں ترتیب کی تبدیلی کا ذکر ہے۔ اس اضافہ کو بھی "زعموا" کے الفاظ ادا کرتے ہیں جس کا عام ترجمہ اردو میں یہ کیا جاسکتا ہے یعنی "خیال کرتے ہیں" پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ خیال کرنے والے کون لوگ ہیں؟ ابن سیرین یہ بھی نہیں بتاتے، جس سے پتہ چل سکتا تھا کہ وہ کس قسم کے لوگ تھے، نیز "زعموا" کا لفظ عربی زبان کے لفظ "زعم" سے بنا ہے، زعم کا یہ لفظ بجائے خود اپنے اندر حد سے زیادہ کمزوری کو چھپائے ہوئے ہے۔ بعض بزرگوں کے متعلق لکھا ہے کہ اپنے لڑکوں سے انہوں نے کہا تھا کہ "زعموا" کا لفظ مجھے بخش دو، یعنی کبھی استعمال نہ کرنا، حدیثوں میں بھی آیا ہے کہ جھوٹ کو چلتا کرنے کے لئے "زعموا" کا لفظ بہت اچھی سواری کا کام دیتا ہے جیسے اس زمانے کی اخبار نویسی میں "سمجھا جاتا ہے" "قیاس کیا جاتا ہے" "معتبر حلقوں سے یہ بات پہنچی ہے" یہ یا اسی قسم کے فقرے دراصل جھوٹ کو آگے بڑھانے کی عصری سواریاں ہیں۔ حافظ ابن حجر نے انقطاع کا نقص بتاتے ہوئے اس روایت کو سنداً مسترد کر دیا ہے (دیکھو اتقان ج:۱، ص:۷۷) اور خواہ مخواہ مان بھی لیا جائے کہ روایت کلیۃً بے اصل نہیں ہے جب بھی عرض کر چکا ہوں کہ "نزولی ترتیب" ایسی تعبیر ہے جس میں سورتوں اور آیتوں دونوں کی ترتیب کا احتمال ہے، لیکن مدعا مدعیوں کا جب ہی ثابت ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ذریعہ سے یہ ثابت کریں کہ سورتوں کی ترتیب نہیں بلکہ ہر سورۃ کی آیتوں کی موجودہ ترتیب کی جگہ نزولی ترتیب حضرت والا نے دی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس احتمال کے تعین کرنے کی قطعاً کوئی صورت نہیں ہے علاوہ اس کے علماء نے لکھا ہے کہ بعض روایتوں سے جو معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ و منسوخ آیتوں کو ایک ہی جگہ مرتب کر کے

حضرت علی نے ایک کتاب لکھی تھی اور اسی کی طرف یہ اشارہ ہے تو بقول آلوسی پھر یہ قرآن کا نسخہ ہی کب باقی رہا، یہ تو "ناسخ و منسوخ" کی دوسری کتابوں کی طرح ایک کتاب ہو گئی اور بیسیوں احتمالات ہیں۔ کہنا یہی ہے کہ لے دے کے اسی ایک ٹوٹی پھوٹی شکستہ و بریدہ روایت کو بنیاد بنا کر یقین کی اس قوت کو مضمحل کرنے کی کوشش کرنا جو قرآن کی موجودہ متواتر و متوارث ترتیب کے متعلق انسانی فطرت رکھتی ہے بجز مغالطہ بازی کے اور کیا ہے۔(۱)

---

(۱) اتقان میں سیوطی نے جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ بعض غیر مشہور کتابوں کا حوالہ دے کر بھی اس روایت کا ذکر کیا ہے مثلاً ابن الضریس کی کتاب "الفضائل" کی طرف منسوب کر کے ابن سیرین ہی کی اس روایت کو درج کرتے ہوئے نئی بات کا اضافہ یہ کیا ہے کہ ابن سیرین سے عکرمہ (مولیٰ ابن عباسؓ) نے اس قصہ کا ذکر کیا تھا اور پھر ابن سیرین نے عکرمہ سے دریافت کیا کہ حضرت علی کے قرآن جمع کرنے کا مطلب کیا تھا۔ "کتب انزل الاول فالاول" یعنی جو پہلے نازل ہوئی اس کو پہلے پھر اس کے بعد جو نازل ہوئی اس کو بعد، بالفاظ دیگر ابن سیرین نے یہ سوال کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نزولی ترتیب پر جمع کیا تھا؟ اسی روایت میں ہے کہ جواب میں عکرمہ نے کہا کہ "جن و انس بھی اکٹھے ہو کر چاہیں کہ قرآن کو اس ترتیب پر مرتب کریں تو یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے۔" عکرمہ کے عربی الفاظ یہ تھے۔ "لو اجتمعت الانس والجن علی ان یؤلفوہ ذلک التالیف ما استطاعوا"۔ اسی طرح ابن اشتہ کی کتاب "المصاحف" سے سیوطی نے نقل کیا ہے کہ ابن سیرین کہا کرتے تھے کہ حضرت علی والے مرتبہ قرآن کے متعلق مدینہ کے لوگوں کو لکھا اور بہت تلاش کیا لیکن مجھے نہ مل سکا اور یہ خبر بھی اس روایت کے جعلی ہونے کی دلیل ہے۔ آخر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ مرتبہ نسخہ اور کسی کے پاس نہ سہی خاندان اہل بیت میں اس کے نہ ملنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے بلکہ بقول ابن حزم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی خلافت کے زمانہ میں پانچ (۵) سال نو مہینے کی مدت ملی، چاہتے تو اپنی حکومت کے ان دنوں میں اپنے مرتبہ نسخوں کو مسلمانوں میں پھیلا دیتے۔

نزولی ترتیب پر قرآن کو مرتب کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا:

ماسوا اس کے سب سے زیادہ دلچسپ مسئلہ بقول مولانا گیلانی یہ ہے کہ نزولی ترتیب کے ڈھنڈورا پیٹنے والوں نے کبھی اس پر غور کیا کہ خدانخواستہ اس ترتیب پر ہر ہر سورۃ کی آیتوں کو مرتب کرنے کی کوشش میں اگر کوئی کامیاب ہو بھی جائے۔ جس طرح وہ نازل ہوتی رہی ہیں تو آیتوں میں اس تاریخی ترتیب کے پیدا کرنے کی سعی لا حاصل کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کو سوچنے کے لیے میں آپ کی توجہ پھر ادھر منعطف کرانا چاہتا ہوں جس کا ذکر شروع مضمون میں بھی اجمالاً آچکا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنی سورتوں کی حیثیت کسی واحد بسیط کتاب کی نہیں ہے بلکہ ہر ہر سورۃ کا موضوع اور اس کی غرض و غایت دوسری سورہ کے مقابلے میں مستقل حیثیت رکھتی ہے علاوہ اس کے کہ تجربہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ سورتوں کے مضامین کی اسی استقلالی حیثیت کے احساس ہی کا نتیجہ عہد صحابہ میں یہ تھا کہ صرف دو سورتیں یعنی "سورۂ انفال اور سورۂ برأت" کے مضامین میں تھوڑا بہت وحدت کا رنگ جو پایا جاتا تھا لیکن پھر بھی دونوں کی حیثیت چونکہ الگ الگ ایک شے تھی، آپ جانتے ہیں کہ امتیاز کے اسی رنگ کو باقی رکھنے کے لیے کیا کیا گیا؟ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ ہر سورۃ دوسری سورۃ سے "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کے فقرہ سے جدا کی گئی ہے، لیکن ان دونوں سورتوں کے بیچ میں "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" نہیں ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے جب پوچھا گیا کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ تو آپ نے فرمایا کہ:۔

"كانت قصتها شبيهة بقصتها فظننت انها منها فقبض رسول الله صلى الله عليه وسلم ولم يبين لنا انها منها فمن اجل ذلك قرنت بينهما ولم اكتب بينهما

"بسم الله الرحمن الرحيم"

(ابوداؤد، ج:۱،ص:۲۵۰، ترمذی، ج:۵،ص:۲۶۲، ازجمع الفوائد، ج:۳،ص:۱۳۵)

ترجمہ: "یعنی دونوں سورتوں کے مضامین ملتے جلتے تھے اس لیے ہم نے خیال کیا کہ یہ (برأت) بھی اسی میں سے ہے (یعنی انفال ہی میں داخل ہے) اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی مگر آپ سے یہ بات معلوم نہ ہوسکی کہ واقعی برأت انفال میں سے ہے اس لیے دونوں کو ہم نے جوڑ تو دیا لیکن "بسم اللہ الرحمن الرحیم" ان دونوں کے بیچ میں نہ لکھا۔"

آپ دیکھ رہے ہیں سورتوں کے مضامین کے سلسلہ میں صحابہ کے نہ حساس کی اس غیر معمولی نزاکت کو؟ سورتوں کی وحدت اور تعدد کا مدار مضامین کی وحدت اور تعدد پر ہے۔ صحابہ کا جو نقطۂ نظر اس باب میں تھا کیا اس کے لیے اس سے زیادہ واضح شہادت کی ضرورت ہے؟ بہر حال یہ ایک واقعہ ہے کہ دیکھنے میں قرآن کی سورتیں بھی چھوٹی نظر آتی ہیں جیسے ہاتھی کے مقابلہ میں چیونٹی، لیکن ایک مستقل جسمانی نظام کی بہر حال چیونٹی بھی مالک ہے۔ یہی حال ہر سورہ کا ہے۔ (۱) اور کہا جا سکتا ہے جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ موضوع اور

(۱) مثلاً سورۂ "قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ" یا الکوثر یا العصر ہی کو لیجئے جن میں تین چار آیتوں سے زیادہ ان میں کوئی سورہ نہیں ہے لیکن جن حقائق اور معانی سے ان میں کی ہر ایک لبریز ہے اور انسانی (جاری ہے)

غرض و غایت کے لحاظ سے جیسے جغرافیہ کا علم طب سے اور طب کا تاریخ سے، تاریخ کا علم کیمسٹری سے اپنی الگ مستقل حیثیت رکھتا ہے، یہی اور بعینہ یہی حال قرآن کی ہر سورہ کا دوسری سورہ کے مقابلہ میں ہے۔

اب ذرا خیال کیجئے کہ نزولی ترتیب پر ہر ہر سورہ کی آیتوں کو مرتب کرنے کے معنی کیا ہوں گے۔ مذکورہ بالا مختلف علوم و فنون مثلاً طب، جغرافیہ، قانون، کیمسٹری، اکانومی وغیرہ کی کتابیں جن کا مصنف فرض کیجئے ایک ہی شخص ہو، اور ان ساری کتابوں کو آگے پیچھے شروع کر کے اس نے خاص مدت میں ختم کی ہوں اب اگر وہی مصنف کی ان تمام قدیم یادداشتوں کے تلاش کرنے میں کوئی کامیاب بھی ہو جائے جنہیں مختلف علوم و فنون کی ان کتابوں کی تالیف و تصنیف کے سلسلہ میں وقتاً فوقتاً مصنف جمع کرتا رہا اور ان ہی کی مدد سے ہر کتاب کو اس نے مکمل کیا تھا۔ پھر ان تمام یادداشتوں میں تاریخی ترتیب پیدا کر کے سب کو مرتب کر کے کسی کتاب کی شکل میں کوئی اگر پیش کرے تو صورت اس کتاب کی کیا ہو جائے گی؟! اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے! اگر آپ کو اس کتاب کی ابتدائی چند سطروں میں تو طب کے کچھ نسخے اور مسائل ملیں اور ان ہی کے بعد فقروں میں جغرافیہ کی معلومات ان کے بعد کیمسٹری کے نظریات علی ہذا القیاس چوں چوں کا مربہ کوئی وقعت ہو یا نہ ہو لیکن یہ کتاب تو یقیناً چوں چوں کا مربہ یا دیوانے کی بڑ یا ہذیان بن کر رہ جائے گی۔

بہرحال قرآن کی موجودہ ترتیبی شکل تو اتر اور تواتر کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے ایک ایسی قطعی حقیقت کے متعلق نزولی ترتیب والی ایسی روایتوں کی مدد سے ترمیم پر آمادہ

۱؎ زندگی کے جن خاص شعبوں کے متعلق حیرت انگیز انکشافات ان سے ہوتے ہیں کیا جانے والے سے پوچھیے کچھ نہیں تو علامہ فراہی کی تفسیر کا اردو میں ترجمہ ہو گیا ہے اس کا مطالعہ کیا جائے۔ ۱۲

ہو جوان کی سند کا حدیثوں کی صحت کے مقررہ معیار پر پورا اترنا آسان نہیں ہے، جنون نے تنقید کا اور کیا ہے، اتقان (ج: ص ۱۰۹) میں سیوطی نے طبرانی کے حوالہ سے ایک روایت نقل کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس کی سند جید ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ کسی نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ صحابی سے پوچھا کہ ایسے آدمی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے کہ۔

"یقرء القران منکوسا۔"

ترجمہ: "قرآن کو الٹ کر پڑھتا ہے۔"

بظاہر اس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ سورتوں کی جو عام ترتیب ہے اس نے اس ترتیب کے الٹ کر قرآن کو پڑھتا ہے، لکھا ہے کہ جواب میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ۔

"ذاک منکوس القلب"

ترجمہ: "وہ اوندھے دل کا آدمی ہے۔"

بتائیے کہ اسی زمانے میں جب اس قسم کے لوگوں کو منکوس القلب کہا گیا تھا تو آج سورتوں ہی کی ترتیب میں تصرف و ترمیم کی جرأت کیوں کی جائے، ہم بے جا جرأت کے ان مجرموں کو کیا سمجھیں یا کیا کہیں حالانکہ میں نے جیسا کہ عرض کیا سورتوں کی ترتیب کا مسئلہ چنداں دشوار بھی نہیں ہے، خود بخاری تک میں ہے کہ ایک عراقی ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ ذرا اپنا قرآن مجھے دکھا دیجئے تو ام المومنین نے فرمایا کہ کس لیے دکھاؤں۔ اس نے کہا کہ آپ کے قرآن کی جو ترتیب ہے یعنی سورتوں کی جو ترتیب ہے اسی ترتیب سے میں بھی اپنے قرآن کی سورتوں کو مرتب کرنا چاہتا ہوں، ام المومنین نے اس وقت جواب میں فرمایا کہ۔

"مایضرک أیۃ قرأت." (بخاری ج:۲،ص:۷۴۷)

ترجمہ: "کسی طرح پڑھو تم تو اس سے نقصان نہ پہنچے گا۔"

میں نے پہلے بھی کہیں کہا ہے کہ بچوں کے لئے عم کا پارہ سہولت کے لیے آج بھی اس ترتیب پر نہیں چھپتا جس ترتیب پر قرآن میں یہ سورتیں ہیں اور یہ وہی بات ہے کہ ایک ہی مصنف کی چند کتابوں کو آپ جس ترتیب سے چاہیں جلد بندی کرا سکتے ہیں کتاب کے معانی و مطالب پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

پس اصل مسئلہ ہر ہر سورۃ کی آیتوں کی ترتیب کا ہے اس مسئلہ میں جیسا کہ سیوطی نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کا اول سے آخر تک اس پر اتفاق ہے کہ آیتوں کی ترتیب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جبرئیل علیہ السلام کے حکم سے دی ہوئی ہے اس ترتیب میں کسی قسم کی ترمیم خود قرآن کی ترمیم ہے، سیوطی کے الفاظ یہ ہیں کہ:۔

"ترتیب الایٰت فی سورھا واقع بتوقیفہ صلی اللہ علیہ وسلم وأمرہ من غیر خلاف فی ھذا بین المسلمین." (اتقان، نوع:۱۸، ج:۱،ص:۶۰)

ترجمہ: "ہر ہر سورۃ میں آیتوں کی ترتیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتانے سے اور حکم سے دی گئی ہے اس میں مسلمانوں کے اندر کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔"

اور میری تو سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ ایسی بھی کوئی کتاب کیا کسی مصنف کی ہو سکتی ہے کہ اس کے فقروں کو تو کسی نے بنایا ہو اور ان فقروں کو جوڑ کر عبارت کسی دوسرے نے بنائی ہو۔

ایسا معلوم ہوتا ہے اور میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ عہد صدیقی میں سورتوں کی جلد بندی جس ترتیب سے کر دی گئی تھی اس کا پابند دوسروں کو نہیں کیا گیا تھا بلکہ جیسے کسی مصنف کی چند کتابوں کو جلد بندھوانے والے جس ترتیب کے ساتھ چاہتے ہیں جلد بندھوا دیتے ہیں، ابتداء میں اسی قسم کی انفرادی آزادی مسلمانوں کو بھی تھی اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے بعض صحابیوں کے قرآن کی ترتیب دوسرے صحابی کے نسخے سے کچھ مختلف ہوتی تھی مثلاً غیر معیاری روایتوں میں ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں "نون" کی سورہ "الذاریات" کے بعد، "القیامہ" کی سورہ "عم یتسائلون" کے بعد، "النازعات" کی "سورہ الطلاق" کے بعد اور "الفجر" کی سورہ "التحریم" کے بعد۔ اسی طرح ابی بن کعب صحابی رضی اللہ عنہ کے مصحف میں کہتے ہیں کہ "الکہف اور الحجرات" کی سورتیں "نون" کے بعد، "تبارک" "حجرات" کے بعد، "النازعات" "الواقعہ" کے بعد، "الم نشرح" "قل ھو اللہ" کے بعد تھی۔

لیکن عہد عثمانی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ کے مجلد کرائے ہوئے قرآن کی نقلیں حکومت نے مرکزی صوبوں میں تقسیم کر کے یہ حکم مسلمانوں کو جب دیا کہ سورتوں کی ترتیب میں بھی اسی کی پابندی کی جائے اور اس حکم کے بعد دوسری ترتیب سورتوں میں بھی قانوناً ممنوع قرار دیدی گئی تو اس وقت سے یہ اختلاف بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

باقی یہ سوال کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں جس ترتیب سے سورتوں کی جلد بندی کرائی گئی تھی آیا یہ صحابہ کی رائے سے فیصلہ کیا گیا تھا، یا رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کے حکم سے یہ ترتیب سورتوں میں قائم کی گئی کوئی واضح روایت اس باب میں نہیں ملتی لیکن امام مالک فرمایا کرتے تھے کہ:

"انما ألفوا القرآن على ما كانوا يسمعونه من النبي صلى الله عليه وسلم." (اتقان ج ۱ ص ۶۲)

ترجمہ: "یعنی اس وقت قرآنی سورتوں میں ترتیب اس ترتیب کی پیروی میں دی گئی جس ترتیب سے صحابہ قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتے تھے۔"

امام مالکؒ کی اس تاریخی شہادت کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ جس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، جبرئیل علیہ السلام کو اس سے پہلے جو رمضان آیا تھا دو دفعہ قرآن آپ نے سنایا تھا۔

یہ روایت بخاری (ج ۲ ص ۷۴۸) وغیرہ تمام صحاح کی کتابوں میں پائی جاتی ہے اس وقت تک بجز چند آیتوں کے قرآن پورا نازل ہو چکا تھا جس ترتیب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل کو سنایا تھا وہی ہے جس کی بلکہ سورتوں کی جلد بندی تک اب خیر القرون کی پیروی میں کی جاتی ہے سورتوں کی ترتیب کا مسئلہ بھی اسی لحاظ سے جبرئیل امین کی توثیق پاتا ہے اور خدا کا فضل ہے کہ سیدنا عثمانؓ کے اس فرمان کے بعد جس میں عہد صدیقی کے مرتبہ مصحف کی پیروی ہر مسلمان کے لیے لازم کر دی گئی۔ اس وقت تک مسلمان مشرق و مغرب میں اول سے آخر تک اس کے پابند ہیں البتہ منزلوں پاروں کی تقسیم وغیرہ کی سہولت کے لیے بھی اس آزادی سے کام لیا جاتا ہے جو اس فرمان کے نفاذ سے پیشتر صحابہؓ میں پائی جاتی تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کے پڑھنے پڑھانے کے سلسلے میں آنحضرتؐ کی خدمات اور

میں قرآنی سورتوں کی جس ترتیب پر اتفاق و اجماع قائم ہو گیا اس کے متعلق یہ خیال کہ اس میں رد و بدل کی حیثیت سے کسی کچھ امکان ہے۔

خیال تو خیال حقیقت یہ ہے کہ کسی زمانہ میں کسی کو کسی قسم کا خطرہ بھی اس وقت تک نہ ہوا تھا جب تک کہ عیسائی پادریوں نے مستشرقانہ کمان اوڑھ کر اغوائی اقدام اور وسوسہ اندازیوں کی مہم شروع نہ کی تھیں۔

"يَأْبَى اللّٰهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ" (التوبہ: ۳۲)

المصادر والمراجع

(۱) إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، طبع سہیل اکیڈمی، لاہور ۱۹۷۶ء

(۲) الاتقان فی علوم القرآن، جلال الدین سیوطی ۹۱۱ھ، طبع سہیل اکیڈمی، لاہور ۱۹۷۳ء

(۳) اسد الغابة، ابن الاثیر، مطبوعہ المکتبۃ الاسلامیۃ طہران

(۴) اعجاز التنزیل

(۵) البرہان فی علوم القرآن، بدر الدین زرکشی، دار احیاء الکتب العربیۃ عیسیٰ البابی حلبی، ۱۹۵۷ء

(۶) التراتیب الاداریۃ، عبد الحی کتانی، دار احیاء التراث العربی، بیروت

(۷) تفسیر در منثور، جلال الدین سیوطی ۹۱۱ھ، دار الفکر، ۱۹۹۳ء

(۸) تاریخ طبری، محمد بن جریر طبری المتوفی ۳۱۰ھ، طبع دار المعارف مصر ۱۹۶۲ء

(۹) التبیان فی مباحث القرآن، صالح الجزائری